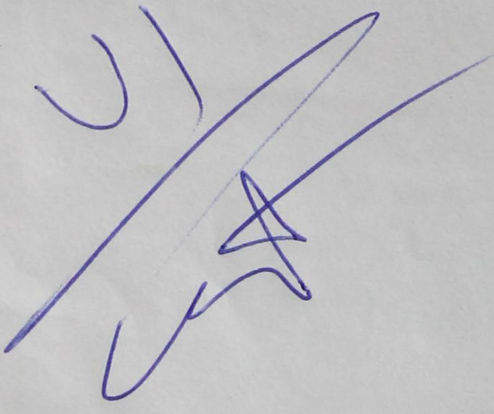
Z

Sohgat-I- Adab.

3:40.

24362

2 4 3 6 2



جنّت میں مشاعرہ

4

جنت میں مشاعرہ

ڈاکٹر عارف بٹالوی

قیمت تین روپے

نیا کتاب گھر اردو بازار

فاروقی پریس، دہلی

ایک دن چشمۂ آبِ شیریں کے قریب انگور کی بیل کے نیچے شعراء کا اجتماع ہوا اُدھر سے کہیں حضرت ابلیس گذر رہے تھے کہ ان کی نظر ان لوگوں پر پڑی۔ حضرت ایک ہی نظر میں بھانپ گئے کہ آدمِ خاکی کے دماغ میں پھر کوئی فتنہ کروٹیں لے رہا ہے فوراً پلٹ کر یہاں پہنچے۔ محفل کی محفل خاموش تھی۔ حیران ہوئے کہ ایک پل میں انہیں کیا سونگھ گیا ہے۔ حضرت ابلیس نے پوچھا۔ تم لوگ جنت میں آکر بھی اُداس ہو۔ اس سے بہتر تو پھر دونوں جہان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اُن میں سے ایک بزرگ نے طنز سے کہا۔ جی ہ

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

حضرت ابلیس نے پھر پوچھا کہ کوئی بات بھی ہے۔ آخر کچھ کہو بھی۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ یا ابلیس ہم تو اس قید سے تنگ آگئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے

اگرچہ سب کچھ عنایت فرمایا ہے لیکن کبھی مشاعرہ کرنے کا موقع نہ د
بغیر تو جنت بھی پھیکی نظر آتی ہے۔ یہ لافانی زندگی اگر یونہی بے کیف
گئی تو ہم تو جی لیئے۔ ابلیس ان کی بات سن کر ہنس دیئے۔ ان لوگوں
کی اس حرکت پر طیش آیا۔ ایک صاحب نے ذرا ترشی سے کہا۔ آپ
شعر کیا چیز ہے شاعری کیا ہے۔ اگرچہ آپ کا وجود سراپا خمیر آتش ہے
کی آگ کو آپ کیا سمجھیں۔ یہ وہ آگ ہے کہ۔ ع

جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ابلیس نے کہا۔ تو تم مجھ پر کیوں برس پڑے میں تو ازراہ
یہاں آ گیا تھا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یوں سر جوڑ کر بیٹھنے سے نتیجہ
میری مانو تو کام بن جائے گا۔ جب حضرت جبرئیلؑ تشریف لائیں تو تم
اداس بیٹھے رہنا اور جب وہ اس کی وجہ دریافت فرمائیں تو اپنا ر
چنانچہ وہ بارگاہِ ایزدی میں تمھارا پیغام پہنچا دیں گے۔ لیکن اس
کہنا کہ حضرت جبرئیلؑ اثر لیئے بغیر نہ جائیں۔۔۔۔ ارے تم لوگ کس
میں پڑ گئے۔ میری بات کو پلّے باندھو فائدہ میں رہو گے۔ ۔۔۔ ا
حضرت جبرئیلؑ تشریف لا رہے ہیں۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔ یہ کہہ کر
ابلیس تشریف لے گئے ان کے بعد حضرت جبرئیل تشریف لائے۔ ا
دیکھا کہ اس گروہ میں سب کے سب شاعر ہیں اور وہ غیر معمولی طور پر
اور اداس نظر آرہے ہیں۔ حضرت جبرئیل کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ
نے جنت کے روح افزا اور دلفریب گوشوں میں روحِ آدم کو یوں اُدا

خاموش دیکھا حضرت نے ان لوگوں سے پوچھا کہ اے جنت کے وارثو خلد بریں
کے مکینو کیا تمہیں بہشت عظمیٰ کی ہوا راس نہ آئی؟ کیا تم اللہ تعالےٰ کی
عنایات میں کمی پاتے ہو یا اس مقامِ کبریٰ کی دل آویزوادیاں پسند نہیں
آئیں! کچھ منہ سے تو بولو کہ حال معلوم ہو۔ ان لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں
تھے اور لبوں پر خفیف سی تھرتھراہٹ۔ ایک صاحب نے ٹوٹتے ہوئے
الفاظ میں عرض کی ہم حضرت کی ہمدردی کے شکر گذار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی
نعمتوں کے بارِ احسان سے اپنی گردنیں بھی نہیں اٹھا سکتے۔ ہمارے رب نے
ہمیں سب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ ہر ایک سہولت بخشی ہے۔ ہماری زندگی
فرشتوں سے بھی عمدہ ہے کہ خلدِ بریں کو بھی رشک آرہا ہے۔ لیکن ہماری ایک
آرزو ہے۔ جو ہمیں بے چین رکھتی ہے۔ اور اس کے اضطراب میں زندگی کی
ساری شیرینی کھٹائی میں پڑجاتی ہے۔ ہمارے سینوں میں ایک آگ سلگ
رہی ہے اور اس تپش کو بجھانے کے لئے سعیِ جنّت بھی بیکار ثابت ہوئی۔
ہماری رگ وپے میں ایک طوفان موجزن ہے کہ آنکھوں کے راستے رستا رہتا
ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیں کہ جس کی یہ کیفیت ہو وُہ اپنے دل کو کسی جنّت سے
بہلا سکتا ہے! ان کی دردبھری کہانی نے حضرت جبرئیلؑ کا دل پگھل گیا اور
پوچھا۔ خدا کے محبوب بندو بتاؤ تمھاری آرزو کیا ہے میں خدا کے حضور میں
تمھارا پیغام پہنچا دوں گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ تمھاری آرزو کو ناکام لے کر نہ
آؤں گا۔ حضرت جبرئیل کے ان الفاظ سے سب کی آنکھوں میں مسرت ناچنے
لگی۔ ان میں سے ایک بزرگ نے کہا۔ یا حضرت جہان فانی میں اردو ادب

کے میخانے بند تھے میں نے انھیں کھولا۔ اہلِ دکن مجھے بے ذوق نظر آئے۔ خاکِ دلی کا ہر ذرہ اس شرابِ نایاب کے لیے بیقرار نظر آیا۔ میں اس خمکدۂ نظم و نثر کو وہاں لے گیا۔ یہ وہ شراب ہے کہ۔ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

چنانچہ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ یہاں بھی ہمیں مشاعرہ کی اجازت مل جائے حضرت جبرئیل نے فرمایا۔ تم مطمئن رہو۔ میں ابھی اللہ کے حضور میں حاضر ہوتا ہوں۔

یہاں سے حضرت جبرئیلؑ اللہ کے حضور میں پہنچے اور بآداب عرض کیا خداوندِ کون و مکاں اجازت ہو تو عرض کروں۔ اللہ نے فرمایا۔ یا جبرئیلؑ کیا کوئی انوکھی بات ہے کہ جس کے لیے اجازت طلب کی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے تو تم ہماری بارگاہ میں کبھی اس انداز سے پیش نہیں ہوئے۔ جبرئیلؑ نے عرض کی۔ یا رحیم و کریم۔ تیرے محبوب بندوں کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ دنیا سے نہیں جنت سے۔ جنت میں شعراء کا ایک گروہ ہے۔ وہ اپنے اللہ کی بے نیازیوں سے کچھ اور مانگ رہا ہے۔ اللہ نے فرمایا بے شک ہم اپنے بندوں کے آقا ہیں۔ ہم اپنے بندوں کی آرزو کو پوری کریں گے کہو کیا آرزو لے کر آئے ہو۔ جبرئیلؑ نے عرض کی۔ یا ربّ العالمین۔ وہ لوگ جنت میں مشاعرہ کی اجازت چاہتے ہیں۔ یہ سن کر عرش معلّٰی کی سمٹی ہوئی مسکراہٹ میں وسعت پیدا ہوئی اور اللہ نے فرمایا۔ یہ مسخرے یہاں آکر بھی خرافات کو نہ بھولے۔ خیر وہ پھر ہمارے بندے ہیں۔ جاؤ انھیں کہدو کہ مشاعرہ کی اجازت

ہے۔ لیکن جنّت میں نہیں اعراف میں کیونکہ دوزخ میں بھی ان کے ہم جنس موجود ہیں۔ شعر سُن کر وہ بھی تڑپ اٹھیں گے۔ جبرئیلؑ اجازت لے کر ان لوگوں کے پاس پہنچے اور کہا اللہ تعالےٰ نے اپنی پُرانی رحمانہ روایت کے مطابق تم لوگوں کو مشاعرہ کی اجازت بخشدی ہے لیکن مشاعرہ اعراف کے مقام پر کرنا ہوگا۔ یہ لوگ جبرئیلؑ کو لپٹ گئے اور مسرت سے اچھلنے لگے۔

مشاعرہ کا دن مقرر ہوا۔ جنّت کے ہر در و دیوار پر بڑے بڑے اشتہار لگائے گئے۔ ہر ایک کو اطلاع کی گئی۔ بڑے اہتمام سے مشاعرہ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ خطۂ اعراف کو ایسا سجایا کہ خلدِ بریں کو رشک آیا مشاعرہ کا دن آن پہنچا۔ پہلی نشست میں حضرت ولیؔ دکنی شمعِ مجلس تجویز ہوئے صدرِ محترم کی نشست تقریباً وسط میں مسہری پر تکیوں کے سہارے ہوئی۔ ایک صف مسہری کے روبرو جنوب میں کرسیٔ صدارت سے شروع ہو کر کسی اور پر ختم ہوئی۔ دونوں صفوں کے مابین کچھ جگہ چھوڑ رکھی ہے جس سے نگہ روبرو کی منزل طے ہوتی ہے۔ لوگ وقت سے کچھ پہلے پہنچ چکے ہیں۔ شاہ مبارک آبرو شیخ شرف الدین مضمونؔ۔ محمد شاکر ناجیؔ۔ محمد احسن احسنؔ۔ غلام مصطفےٰ خاں یکرنگؔ۔ شیخ ظہور الدین حاتمؔ۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ۔ اور اشرف علی خاں فغاںؔ۔ نیز کچھ اور صاحب تشریف فرما ہیں۔ آنے کا سلسلہ جاری ہے۔ باہمی مصافحے اور معانقے اور مزاج پرسی کی رسم ادا ہو رہی ہے۔ اتنے میں دو چار بزرگ ہستیوں کے ساتھ حضرت ولیؔ دکنی تشریف لے آئے

سب کے سب بہر تعظیم اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت ولی کرسی صدارت پر رونق افروز ہوتے سب لوگ بیٹھ گئے۔ حضرت ولی نے چغہ کی دائیں جیب سے کاغذ نکالا۔ حاضرین جلسہ کی طرف مخاطب ہو کر ایک خاموش نگاہ کی محفل میں سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص صدر محترم کی طرف متوجہ ہوا۔ حضرت ولی نے کاغذ کو سنہری تپائی پر رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔

"میں خوش ہوں کہ آج ایک مدت کے بعد پھر وہ چند صورتیں ایک جگہ نظر آئی ہیں جنھیں ادب اُردو سے عشق ہے اور جن کے عشق کے صدقے آج ادب اردو کا طوطی بول رہا ہے یہ اللہ تعالےٰ کا عین احسان ہے کہ جس نے اپنی بے نیازیوں کے طفیل ہم لوگوں کو جنت جیسی مقدس جگہ میں مشاعرہ کی اجازت بخشی ہے۔ اس معاملہ میں حضرت جبرئیلؑ کے خاص طور پر صمیم قلب سے شکر گذار ہیں جنھوں نے ازراہِ عنایت ہماری معاونت فرمائی۔"

اللہ تعالیٰ نے بیحد مہربانیوں کے ساتھ ایک ہفتہ کے لیے مشاعرہ کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ چنانچہ بزم ادب کو آپ حضرات کی طرف سے پوری توقع ہے کہ آپ اس ہفتہ کو پُر بہار بنانے کے لیے سعی اکمل فرمائیں گے۔ بزم ادب نے اِس بے نظیر ہفتہ کا پروگرام مرتب کر لیا ہے جس کے ماتحت آج کی نشست میں مندرجہ ذیل حضرات اپنے کلام سے بزم کے ارادوں کو تقویت

بخشیں گے اور اہلِ مجلس کو لطف اندوز فرمائیں گے

۱۔ حضرت شاہ مبارک ابرو۔
۲۔ حضرت شیخ شرف الدین مضمون
۳۔ حضرت محمد شاکر ناجی
۴۔ حضرت محمد احسن احسن
۵۔ حضرت غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ
۶۔ حضرت سراج الدین علی خاں آرزو
۷۔ حضرت اشرف علی خاں فغاں۔

فہرست کے خاتمہ کے ساتھ ہی تالیوں سے محفل گونج اٹھی۔ حضرت ولی نے خاموشی کے لیے ہاتھ سے اشارہ کیا محفل خاموش ہو گئی۔ حضرت ولی نے فرمایا میں حضرت ابرو صاحب سے درخواست کرتا ہوں۔ اتنا کہنا تھا کہ محفل میں پھر تالیوں کا شور اٹھا۔ حضرت ابرو صاحب صدر صاحب کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ حضرت ولی نے بہ اصرار کچھ سنانے کے لیے ایما فرمایا۔ بہ تعمیل ارشاد حضرت ابرو نے کاغذ نکالا۔ حضرت ولی نے حضرت آبرو کا اہلِ مجلس سے یوں تعارف فرمایا۔

"آپ کا اصل نام نجم الدین تھا۔ لیکن بچپن ہی سے آپ کو شاہ مبارک کے نام سے پکارتے تھے۔ سو وہی نام مستقل ہو گیا۔ ابرو تخلص فرماتے ہیں۔ پرانے مشاق ہیں۔ ایہام گوئی سے آپ کو زیادہ رغبت ہے۔ چنانچہ آپ کے کلام میں اس کا مزا ملتا ہے۔" آپ صوفیانہ انداز اور پاک طینت رکھتے ہیں۔ اگر

میں یہ کہوں کہ آپ کی شاعری کا وجود پاکبازی پر مبنی ہے تو کچھ بیجا نہ ہوگا" سمجھنے والے حضرت ولی کا ایک ایک لفظ سمجھ گئے۔ محفل قہقہوں سے گونج گئی وہ اس لیے کہ حضرت ولی نے شاعرانہ انداز میں حضرت ابرو پر ایک لطیف سی چوٹ کی ہے۔ کیونکہ حضرت ابرو کو شاہ کمال بخاری کے صاحبزادے پیر مکھن المتخلص پاکباز سے بہت محبت تھی۔ حضرت ابرو کچھ شرمائے گئے اور مجلس کے اصرار پر غزل کہی۔

غزل

آیا ہے صبح نیند سے اُٹھ رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد
سونا وہ ہے کہ ہووے کسوٹی اکسا ہوا

انداز سیں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
جو خال اپنے حد سے بڑھا سو مسا ہوا

قامت کا سب جگت میں بالا ہوا ہی نام
قد اس قدر بلند تمہارا رسا ہوا

دل یوں ڈرے ہے زلف کا مار اصحو ہیں
اسی سیں اژدہا کا ڈر سے جوڑ سا ہوا

اے ابرو اول توں سمجھ پیچ عشق کا
پھر زلف سے نکل نہ سکے دل پھنسا ہوا

ایک ایک شعر پر داد کی بوچھاڑ ہوئی واہ واہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ حضرت ابرو غزل پڑھنے کے بعد اٹھنے لگے تو ساری محفل پکار اٹھی نہیں صاحب ایک اور۔ چنانچہ حضرت ابرو پھر بیٹھ گئے۔ جیب میں سے کاغذ نکالا

اور غزل کا مطلع ایک عجیب انداز میں کہا۔

غزل

نین سے نین جب ملائے گیا
دل کے اندر میرے سمائے گیا

نگہ گرم سیں میرے دل میں
خوش نین آگ ہی لگائے گیا

تیرے چلنے کی سن خبر عاشق
یہی کہتا گیا کہ ہائے گیا

سہو کر بولتا تھا مجھ سیتی
بوجھ کر بات کو چھپائے گیا

ابرو ہجر بیچ مرتا تھا
مکھ دکھا کر اُسے جلائے گیا

اس غزل کے ایک ایک مصرع پر بھی واہ وا۔۔ واہ وا کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ اب لوگوں کا اشتیاق اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس غزل کے بعد حضرت اٹھ کر کیسے چلے جاتے۔ حضرت ابرو اٹھنے ہی تھے کہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ اگر حضرت ابرو اور کلام نہیں سناتے تو ہم جاتے ہیں۔ حضرت ابرو کو اس سے زیادہ داد اور کیا مل سکتی تھی۔ پھولے نہ سماتے۔ اور مسکرا کر پھر بیٹھ گئے اور جو غزل دماغ میں محفوظ تھی سُنانی شروع کی۔

غزل

مت قہر سیتی ہاتھ میں لے دل ہمارے کوں
جلتا ہے کیوں پکڑتا ہے ظالم انگارے کوں

ٹک باغ میں شتاب چلو اے بہار حسن — گل چشم ہو رہا ہے تمہارے نظارے کوں
مرتا ہوں ٹک لبے ہی ہو رمق آ ورس دکھا — جا کر کہو ہماری طرف سے پیارے کوں
کہیں آ پڑا ہوں عشق کے ظالم بھنور کے بیچ — تختہ اُدھر چلا وتے نہیں جی کے آرے کوں

اپنا جمال ابرو کوں ٹک دکھاؤ آج
مدت سے آرزو ہے درس کی بچارے کوں

اس غزل پر بھی وہی قیامت تھی وہی اصرار تھا کہ کچھ اور بس ایک اور۔ لو وعدہ لو کہ پھر نہ کہیں گے۔ حضرت ابرو محفل کے اصرار پر مجبور تھے۔ حضرت ولی نے بھی فرمایا کہ بھئی ابرو محفل کا اصرار سر آنکھوں پر ایک غزل اور سہی حضرت ابرو نے تعمیل ارشاد کے لیے اندر کی جیب میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کی۔

غزل

افسوس ہے کہ مجھ کوں وہ یار بھول جاوے — وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے
رستم تیری آنکھوں کے ہووے اگر مقابل — انکھیوں کو دیکھ تیری تلوار بھول جاوے
عارض کے آئینہ پر تمنا کے سبز خط ہی — طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جاوے
کیا شیخ و کیا برہمن جب عاشقی میں آویں — تسبی کرے فراموش زنار بھول جاوے

یوں ابرو بناوے دل میں ہزار باتاں
جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

غزل کے خاتمہ پر تالیوں سے محفل گونج اٹھی۔ حضرت ولی نے فرمایا۔ بھئی آبرو آج تو آبرو رکھ لی۔ فی الحقیقت شعر کہتے ہو۔ حضرت آبرو آداب بجالائے اور اپنی جگہ پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد حضرت ولی نے۔ شیخ شرف الدین صاحب مضمونؔ کی خدمت میں درخواست گذاری۔ حضرت مضمونؔ نے طبیعت کی خرابی کے باعث معذرت پیش کی در اصل بات یہ ہے کہ نزلہ کی وجہ سے آپ کے تمام دانت گر چکے ہیں۔ بقول خان آرزوؔ شاعر بیدانہ سر محفل ہمکلام ہونے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت محمد شاکر ناجی کا نمبر آیا تو حضرت ولیؔ نے انکا تعارف فرمایا "آپ سید محمد شاکر ناجی صاحب ہیں۔ دیکھئے ذرا ان سے سنبھل کر مخاطب ہوجیے تیز مزاج اور شوخ طبع بہت ہیں راہ چلتے سے اُلجھتے ہیں اور جس کے گرد ہوتے ہیں اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔" ولیؔ صاحب کے ان جملوں پر وہ قہقہے لگے کہ ناجی صاحب کا چہرہ تمتما گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت آبرو نے ناجی صاحب کی تعریف میں یہ کہتے ہوئے فوراً یہ شعر پڑھا۔ آبرو صاحب نے کہا۔ آپ کی شوخیاں غزل کا حُسن ہیں آپ کی تیز مزاجی گرمیٔ سخن ہے اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو ناجی صاحب کے کلام میں حرارت کہاں سے آئے۔ اس کے علاوہ جو مٹھاس ناجی صاحب کے کلام میں ہے اُس سے بہت لوگ آگاہ ہیں۔ ؎

سخن سنجاں میں رہیگا آبرو آج
نہیں شیریں زباں شاکر سریکا

اس شعر نے حضرت ناجی کے دل پر ایک گہرا اثر کیا۔ اب کے لب تبسم

پر مسرت کی ہلکی سی لہر رقصاں ہوئی چنانچہ آپ نے جیب سے کاغذ نکالا شمع مجلس کی اجازت سے غزل پڑھنی شروع کی۔

دیکھ موہن تیری کمر کی طرف
پھر گیا خالی اپنے گھر کی طرف

جن نے دیکھے تیرے لب شیریں
شکر ان کی نہیں شکر کی طرف

ہے محال اُن کا دام میں آنا
دل ہے ان سب بتاں کا ندر کی طرف

تیرے رخسار کی صفائی دیکھ
چشمِ دانا نہیں ہنر کی طرف

حشر میں پا کیا نہ ہے ناجی
بد عمل جائیں گے سقر کی طرف

اس غزل پر کسی طرف سے کوئی داد نہ ملی حضرت ناجی رنجیدہ ہوئے اور حضرت ولی صاحب سے کہا۔ آپ نے میری غزل سُنی؟ حضرت ولی نے فرمایا۔ ہاں سُنی اور غور سے سُنی۔ حضرت ناجی نے پوچھا کوئی شعر پسند فرمایا۔ حضرت ولی نے جواب دیا۔ پسندیدہ شعر پر زبان تو کیا دل بھی پکار اُٹھے گا۔ کوئی دوسری غزل ہو تو سنایئے۔ حضرت ناجی نے دوسری جیب میں سے کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کی۔

غزل

معشوق مل کر آپ سے گر دلبری کرے
گردیو ہو تو چاہیئے آدم گری کرے

شیشہ اسی کے آگے بجا ہے کہ شیخ ہیتی
پیالے کو جب لے ہاتھ میں رنگا پری کرے

اس قد سے جب چمن میں خراماں ہو تو اے جاں　　شمشاد و سرو آگے تیرے چاکری کرے

یہ شعر سن کر واہ وا۔ واہ وا۔ پھر ارشاد فرمایئے کی صدائیں چاروں طرف سے بلند ہوئیں۔ حضرت ولیؔ نے فرمایا بھئی ناجی شعر بہت عمدہ ہے۔ حضرت ناجیؔ نے جھک کر شکریہ ادا کیا اور اسی شعر کو دوبارہ پڑھا۔

اس قد سے جب چمن میں خراماں ہو تو اے جاں　　شمشاد و سرو آگے تیرے چاکری کرے

دشمن ہی دین کا خال سیہ مکھ اُوپر تیرے　　ہندو سے کیا عجب ہے اگر کافری کرے

اس شعر پر حضرت ولی بھی تڑپ اُٹھے اور شعر کو آہستہ آہستہ دہراتے ہوئے سر دھنتے رہے۔ حضرت ناجیؔ نے اس شعر کو کئی بار پڑھا اور ہر بار محفل نے نیا لطف اٹھایا۔ اس کے بعد ناجی صاحب نے غزل کا مقطع پڑھا۔ ؎

ناجی جو کوئی صاف کرے دل کا آئینہ
وہ عاشقی کے ملک میں اسکندری کرے

غزل کے خاتمہ پر حضرت ولیؔ نے درخواست فرمائی کہ اگر کوئی اور شعر یاد ہوں تو سنائیو آپ کے بعض شعر تو نشتر کا کام کر جاتے ہیں۔ حضرت ولیؔ کا یہ جملہ داد کا بہترین حاصل ہے چنانچہ حضرت ناجیؔ آداب بجالائے اور اپنے دو بند سنائے اور عرض کی۔ قبلہ عالم! نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں بندہ خود شامل تھا۔ اس وقت دربار دہلی کا رنگ۔ شرفا کی خواری۔ پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور نازپروری کو ایک طولانی مخمس میں لکھا ہے۔ افسوس کہ اس وقت دو بند یاد ہیں سو عرض کرتا ہوں۔

ملاحظہ فرمائیں :-

لڑے ہوتے تو برس ہیں انکو بیتے تھے　　دعا کے زور سے دوائی دوا کے جیتے
شرابیں گھر کی نکالی مزے سے پیتے تھے　　نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے
گلے میں ہنسیاں بازو اور سر طلا کے نال

اس بند کو سنکر ساری محفل پر سناٹا سا چھا گیا۔ حضرت ولی کی آنکھوں سے
آنسو رواں تھے اور جھوم رہے تھے۔ حضرت ناجی نے مخمس کا دوسرا بند پڑھ

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا　　کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا　　ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھا
نہ ظرف و مطبخ و دکان نہ غلہ نہ بقال

حضرت ناجی شمع مجلس کی خدمت میں ادب بجالاتے ہوئے اٹھے حضر
ولی نے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا۔ ناجی صاحب! کبھی وقت ملے تو تشر
لے آیئے گا۔ مخمس سننے کو جی چاہتا ہے۔ حضرت ناجی نے عرض کی۔ بندہ
ہی فرصت میں قدم بوسی کے لیے در دولت پر حاضر خدمت ہو جائے گا۔ ان
بعد حضرت محمد احسن صاحب احسن تشریف لائے اور قبلہ صدر کی اجازت
حاصل کرنے کے بعد اپنا کلام سنایا۔

غزل

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں　　کہ کر کر قول پرسوں کا گیا برسوں ہوئے برس

غزل کے مطلع ہی نے ساری محفل میں آگ لگا دی ہر ایک شخص تڑپ ا

شمع مجلس نے بڑی مشکل سے حاضرین کو خاموش کیا۔

عجب نہیں ابر گر جلتوں کو تو برسوں جلا دیگا — گیا ہی یار میرے برسوں کہتا ہی کہ میں ہم سوں
یہ قاصد وعدہ کرتا ہی جو برسوں کا کہ پھر آوے — کبھو تو پھر نہیں آتا گلی اس کی بیٹھی برسوں
ترس تجھکو نہیں اے شوخ اتنی کیا ہی ترسائی — تیرے دیدار کو میں دیدۂ تر سوں کھڑا ترسوں
تیرے تل سوں مجھے نت مینہ کا سو وعدہ ہے اے ظالم — عجب نہیں ہے اگر تو تیل نکساوے مرے سر سوں
زلف تیری معطر ہے عطر فتنے بسینتی ظالم — الٰہی آبرو رکھیو پڑا ہے کام اب تر سوں

غزل اس طرح سی کہنی بھی احسن تجھ سوں بن آوے
جواب اب آبرو کب کہہ سکے مضمون بہتر سوں

مقطع میں حضرت آبرو اور مضمون دونوں پر شاعرانہ چوٹ کر گئے اور وہ بھی اس چیز کو پا گئے۔ محفل قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھی۔ ان کے بعد حضرت غلام مصطفےٰ خاں صاحب یکرنگ کی خدمت میں درخواست گذاری گئی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر جناب صدر صاحب کے قریب تشریف فرما ہوئے۔ اور بڑے ادب سے عرض کی مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس میری کوئی غزل نہیں ہے اور مجھ میں یہ نقص ہے کہ میرے حافظہ میں نہ اپنی نہ پرائی کبھی کوئی غزل محفوظ نہیں رہتی البتہ اکا دکا کوئی شعر یاد آجائے تو سنا دیتا ہوں چنانچہ اب بھی بہ تعمیل ارشاد حافظہ پر زور دیتا ہوں (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا) لیجئے ایک دو شعر عرض کرتا ہوں ؎

یکرنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط — رکھتا ہوں دو نین جو کہو تو نذر کروں

حاضرین نے شعر کو بہت پسند فرمایا اور ہر طرف سے داد ملی۔ اس کے بعد دوسرا شعر پڑھا گیا۔ ؎

جو کوئی توڑتا ہے غنچۂ گل
دلِ بلبل شکستہ کرتا ہے

اس شعر پر واہ وا۔ کی صدائیں بلند ہوئیں پھر تیسرا شعر پڑھا گیا۔

پارسائی اور جوانی کیونکر ہو
ایک جگہ آگ پانی کیونکر ہو

یہ شعر سنکر حضرت ولی نے بے ساختہ فرمایا۔ تخیّل آرائی آپ پر ختم ہے حضرت یکرنگ نے شکریہ ادا کیا اور دو شعر اور پڑھے۔ ؎

نہ کہو بیکہ یار جاتا ہے — دل سے صبر و قرار جاتا ہے
گر خبر لینی ہو تو لے صیّاد — ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

یہ اشعار سننے کے بعد مجلس میں ہر ایک شخص اچھل رہا ہے۔ ہر ایک کی زبان پر یہ شعر ہے۔ ؎

نہ کہو بیکہ یار جاتا ہے
دل سے صبر و قرار جاتا ہے

اس کے بعد حضرتِ یکرنگ نے معذرت پیش کرتے ہوئے عرض کی کہ مجھے افسوس ہے کہ اب کوئی شعر یاد نہیں آتا اور یہ کہہ کر شمعِ مجلس کا آداب بجا لانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے۔ ان کے بعد حضرت ولی نے شاہ حاتم کی خدمت میں درخواست کی شاہ حاتم تشریف لائے۔ محفل میں

تالیوں کی فضا گونج اٹھی۔ شمع مجلس نے رسمی طور پر تعارف فرمایا:۔ آپ شیخ ظہور الدین صاحب حاتم شاہجہاں آبادی ہیں۔ آپ کی خوش مزاجی اور ظرافت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ فقیری اختیار کرنے پر بھی بانکوں کی طرح دوپٹہ سر پر ٹیڑھا ہی باندھتے ہیں۔ آپ کے اشعار آپس کی باتیں اور زبان شستہ ورفتہ ہے۔ اس کے بعد حضرت حاتم نے کہا۔ آج میں دو غزلہ لکھ کر لایا ہوں ملاحظہ ہو۔

غزل ۱

یہاں طالعوں سے رلتا ہے پیارا — بخت دیکھے ہے زاہد استخارا
میں پایا ہوں ولے تجھ چشم کا بصیر — نہ مانگوں گا کبھی ان کا اشارا
نہال دوستی کو کاٹ ڈالا — دکھا کر شوخ نے ابرو کا آرا
لیا اس گلبدن کا ہمنے بوسہ — تو کیا چو رقیبوں نے ہمارا

کئی عالم کئے ہیں قتل ان نے
کرے کیا اکیلا حاتم بچارا

غزل پر خوب داد ملی بالخصوص مقطع پہ تو شمع مجلس بھی داد دئے بغیر نہ رہ سکے اس کے بعد حضرت حاتم نے دوسری غزل کہنی شروع کی۔

غزل

چھپا نہیں جا بجا حاضر ہے پیارا — کہاں وہ چشم! جو ماریں نظارا

جدا نہیں سب سیتی تحقیق کر دیکھ ملا ہے سب سے اور سب سے ہو نیارا
مسافر اُٹھ تجھے چلنا ہے منزل بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا
مثالِ بحر موجیں مارتا ہے کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا
بسانِ خلق سے یوں بھاگتے ہیں کہ جوں آتش ستی بھاگے ہو پارا
سمجھ کر دیکھ لب جب سیکھ ماہی کہاں ہیگا سکندر کاں ہے دارا
کہاں ہے اہلِ عرفاں اس کو جیتا جو مر کر عشق میں دنیا سوں ہارا

صفا کر دل کے آئینہ کو حاتم
دکھا چاہیئے سجن گر آشکارا

غزل کے خاتمہ پر حاضرین نے تالیوں سے فضائے محلس میں ایک لطیف شور برپا کر دیا۔ شمع محلس نے حضرت حاتم سے درخواست کی کہ وہ کچھ اور سنائیں۔ حاتم صاحب نے اگرچہ بہتیرا انکار کیا لیکن حاضرین کے اصرار پر حاتم صاحب مجبور ہو گئے اور ایک شعر پڑھا۔

سر پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

واہ وا۔ واہ وا۔ مطلع خوب ہے حاتم صاحب! خوب ہے۔ بہت خوب ہے۔ چاروں طرف سے یہ آوازیں بلند ہوئیں۔ اسی محفل میں حضرت حاتم کے شاگرد میاں رنگین بھی موجود تھے۔ ان کے مزاج میں چالاکی اور بیباکی بہت تھی لیکن شعور کم تھا۔ اپنی نادانی سے گستاخانہ بول اُٹھے۔

کہ اگر مصرعِ ثانی اِس طرح ہو تو اچھا رہے۔ ؎

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے

ہم شبِ ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

محفل میں سے ایک صاحب بولے کہ صاحبزادے۔ استاد کے سامنے یہ گستاخی زیبا نہ تھی۔ چونکہ سب لوگ حضرت حاتم کا احترام کرتے تھے اس لئے سب نے رنگین کی اِس حرکت کو ناپسند کیا۔ میاں رنگین کچھ نادم سے ہو گئے۔ حضرت حاتم دور اندیش واقع ہوئے ہیں۔ آپ نے اس خیال سے کہ صاحبزادہ کی دل شکنی نہ ہو جائے مبادا وہ عشقِ سخن چھوڑ دے میاں رنگین کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فرمایا "آفریں آفریں - ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات۔ انشاءاللہ تمھاری طبیعت بہت ترقی کرے گی۔ عشق نہ چھوڑنا۔ مجھے تمھارا شعر بہت پسند آیا واللہ میں دیوان میں اسی طرح لکھوں گا" حضرت حاتم کی دریا دلی اور نیک نیتی سے حاضرین پر ایک خاص اثر پڑا اور حاتم زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ ان کے بعد حضرت سراج الدین علی خاں آرزو کی باری آئی۔ حضرت ولی نے انکا تعارف فرمایا :-

"خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامنِ تربیت سے ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اٹھے جو زبانِ اردو کے اصلاح دینے والے ہیں"

ان تعریفی جملوں پر خوب تالیاں بجائی گئیں۔ محفل میں سے ایک نوجوان اٹھ کر جانے لگے یہ صاحب حضرت آرزو صاحب کے شاگردوں میں سے ہی تھے۔ حضرت آرزو نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ نہ بیٹھے۔

پھر ثانی حکم فرمایا تو بھی نہ بیٹھے اس کے بعد حضرت آرزو نے ان سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

سب ہنس پڑے اور وہ نادِم ہو گئے۔ آگے بڑھ کر معافی چاہی اور بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حضرت آرزو نے فرمایا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے ساتھ بیاض نہیں لایا چنانچہ جو شعر حافظہ میں موجود ہیں عرض کئے دیتا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔ عرض کیا ہے۔

رکھے سیپارہ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

ہر شخص نے داد دی۔ واہ وا۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔ شعر خوب ہے واللہ۔

شعر عرض کرتا ہوں۔ ؎

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

بہت خوب۔ واہ وا۔ کیا عمدہ تخیل ہے، کیا بلند پروازی ہے۔ خیال اچھوتا ہے واللہ

شعر عرض کیا ہے۔ غور طلب ہے۔ ؎

اس زلف سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

واہ وا۔ آخر استاد ہیں۔ تخیل کی یہ نیرنگیاں آپ ہی کا حصہ ہیں۔
حضرت ولی نے بھی خوب داد دی اور فرمایا۔ کاش ایسا شعر میں بھی کہہ سکتا۔
حضرت آرزو نے جھک کر سلام کیا ادب بجا لائے اور داد و تحسین کا شکریہ ادا
کیا۔ اور شمع مجلس سے مخاطب ہو کر کہا قبلہ شعر تو ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

فغاں مجھ مست بن پھر خندہ قلقل نہ ہوئیگا
مے گلگلوں کو شیشہ ہچکیاں لے لیکے رو دیگا

حضرت ولی اُٹھے اور آرزو کو سینے سے لگا لیا اور فرمایا۔ قلقلِ مینا کی تصویر جس انداز سے آپ نے کھینچی ہے زمانہ سر پٹکتا رہے گا لیکن یہ انداز نصیب نہ ہوگا۔ ساری محفل تالیوں سے گونج اٹھی واہ وا کے نعرے بلند ہوئے اور دیر تک یہی عالم رہا۔ اِن کے بعد حضرت ولی نے جناب اشرف علی صاحب فغاں کو کلام سُنانے کے لیے کہا وہ تشریف لائے۔ اور شمع مجلس نے تعارف فرمایا۔ آپ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ ظریف الملک حضرت اشرف علی خاں فغاں ہیں۔ اس سے زیادہ تعریف مرزا سودا سے سُنیئے جو آپ کے شعر مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ اس تعریف پر حاضرین نے تالیاں بجائیں۔ حضرت فغاں نے کہا۔ کل رات ایک غزل کہی ہے۔ عرض کرتا ہوں۔ ؎

غزل

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گذر گئی   اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی

کیا خوب مطلع ہے واہ وا - واہ وا - "اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی"
کیا کہنے ہیں - زبان اسے کہتے ہیں - شمع محلس نے بھی اس مطلع پر خوب داد دی
حضرت فغاں نے شکریہ ادا کیا اور بہت جھک کر کیا اور پھر غزل کا
شعر پڑھا -

شکوہ تو کیوں کرے ہے میرے اشک سُرخ کا
تیری کب آستین میرے لوہو سے بھر گئی

واہ وا - جواب شکوہ میں اندازِ شکوہ - فغاں صاحب اسے آپ ہی نبھا
سکتے تھے - شعر بہت خوب ہے -

اِتنا کہاں دقیق بصارت ہے چشم کی
دل بھی ادھر گیا جیدھر میری نظر گئی

دل کے ساتھ نظر کا جانا ایک حقیقت ہے واہ وا کیا اسلوب بیان ہے
کیا انداز ہے واللہ

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو بوں کہوں
انصاف کو نہ چھوڑ مروت اگر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گذر گئی میری وُوں بھی گذر گئی

واہ واہ۔ کیا شعر کہا ہے۔ کیا زبان پائی ہے کیا انداز ہے واللہ۔ فغاں صاحب مصرع عمر بھر یاد رہے گا۔ یوں بھی گذر گئی میری دوں بھی گذر گئی۔ شمع مجلس نے مکرر کہنے کی فرمائش کی۔ شعر مکرر پڑھا گیا حاضرین نے خوب لطف اٹھایا۔ فغاں صاحب نے شکریہ ادا کیا اور کہا مقطع عرض کرتا ہوں۔

آخر فغاں وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی

محفل تالیوں سے گونج اٹھی دیر تک تالیاں بجتی رہیں اور دوسری غزل کی فرمائش ہوئی بہ اصرار مجلس حضرت فغاں نے دوسری غزل پڑھی۔

غزل

آ میرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے　　مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہو
یا الٰہی یہ ستمگار کہاں جاتا ہے　　کج کلہ تیغ بکف چیں بر آبرو بے باک

اس شعر پر مجلس نے کہا۔ فغاں صاحب آپ نے قاتل کی صحیح تصویر کھینچ دی ہے۔ فغاں نے شکریہ ادا کیا اور کہا سخن شناسی کا ممنون ہوں۔

لئے جاتی ہے اجل جانِ فغاں کو اے یار
لیجیو تیرا گرفتار کہاں جاتا ہے

حاضرین نے خوب داد دی ایک ایک شعر پر تالیاں بجائی گئیں۔ خوب ہے بہت خوب ہے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ شمع مجلس نے فغاں سے کہا۔

ہم نے سُنا ہے کہ آپ نے کل رات ایک غزل اپنے حلقۂ احباب میں پڑھی اور وہ بہت پسند کی گئی ہے یاد ہو تو سُنایئے۔ فغاں نے غزل سنائی۔

غزل

کھا پیچ و تاب مجھکو ڈسیں اب وہ کالیاں
ظالم اسی لیے تیں نے زلفیں ہیں پالیاں

تنہا نہ در کو دیکھ کے گرتے ہیں اشکِ چشم
سوراخ دل میں کرتی ہیں کانوں کی بالیاں

دیکھا کہ یہ تو چھوڑتا ممکن نہیں مجھے
چلنے لگا وہ شوخ مراتب یہ چالیاں

ہر بات بیچ روٹھنا ہر دم میں ناخوشی
ہر آن وو کھنا مجھے ہر وقت گالیاں

ایذا ہر ایک طرح سیں دینا غرض مجھے
کچھ بس نہ چل سکا تو یہ طرحیں نکالیاں

ہمنے شراب فراق میں سنتا ہے اے فغاں
کیا خاک لوگے حسرتیں دل کی نکالیاں

شمع مجلس نے غزل سنکر کہا۔ سبحان اللہ۔ اس بڑھاپے پر ایسی زندہ دلی اس کمال پر ایسی بے تکلف سادہ مزاجی۔ اللہ خوش رکھے اور سلامت ان لوگوں کو جن کے دم سے ادب قائم ہے۔" محفل میں جگنو میاں بھی تشریف فرما تھے غزل سنکر بول اُٹھے کہ حضرت اٹالیاں کا قافیہ تو رہ گیا۔ فغاں خاموش رہے۔ شمع مجلس نے فرمایا۔ فغاں صاحب جگنو میاں کی فرمایش پر غور فرمایا۔ فغاں نے کہا۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ حضرت ولی نے فرمایا۔ شوق سے چنانچہ حضرت فغاں نے اس وقت یہ شعر کہا۔

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اسکو بجاتے ہیں تالیاں

تمام مجلس چمک اٹھی اور جگنو میاں مدھم پڑ گئے۔ حضرت فغاں نے حاضرین کو مخاطب فرماتے ہوئے فرمایا یہ حقیقت ہے کہ شمع مجلس دلّی اور دکّن کے شریف ونجیب فصیح زبان ہیں اور ان کی غزل خوانی سے نفسِ ناطقہ کی روح نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلی۔ اگر امیر خسرو کا زمانہ زبان اردو کے لیے صبح کاذب ہے تو اس کی صبح صادق شاہانِ دکّن کے عہد میں ہوئی۔ ؎

ساغرِ اردو میں اب خطِ جلی پیدا ہوا
میکشانِ ریختہ میں اک ولی پیدا ہوا

حاضرین نے اس تعریف پر تالیاں بجائیں۔ حضرت فغاں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ حضرت ولی نظم اردو کی نسل کے آدم ہیں۔ حضرت ولی کو ریختہ کا موجد کہنا بجا ہے۔ ہم با ادب شمع مجلس کی خدمتِ اقدس میں درخواست گذارتے ہیں کہ آپ اپنے کلام سے محفل کے دل کے گوشوں میں ادب اردو کی قدر و منزلت کے جذبہ میں اضافہ فرمائیں۔ اتنا کہہ کر حضرت فغاں بیٹھ گئے۔ اور حضرت ولی نے فرمایا۔ میں جس مقام پر دیکھا جا رہا ہوں میں اپنے تئیں وہاں نہیں پاتا ہوں۔ بہرحال حوصلہ افزائی کا شکریہ چند دل کے ٹکڑے ہیں پیش کئے دیتا ہوں۔ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

عزیزو کیا ہے پرولے نے کے دل میں
کہ جی دینا اسے آساں ہوا ہے

شعر پر خوب داد ملی۔

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو　　کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

واہ وا۔ بہت خوب۔ واللہ شعر خوب ہے۔ پھر ولی صاحب نے زبانِ ریختہ میں ایک غزل کہی۔ جس پر محفل لوٹ لوٹ گئی اور حاضرین نے جوش و خروش سے اُٹھ اُٹھ کر داد دی۔ غزل کے ہر شعر پر واہ وا کی صدائیں بلند ہوتیں۔

غزل

بیوفائی نہ کر خدا سوں ڈر　　جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
ہے جدائی میں زندگی مشکل　　آجدائی نہ کر خدا سوں ڈر
اس سوں جو آشنائی ڈر کر ہے　　آشنائی نہ کر خدا سوں ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور　　خود نمائی نہ کر خدا سوں ڈر

اے ولی غیر آستانہ یار
جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

غزل ختم کرنے پر شمع مجلس نے فرمایا۔ میں بہت خوش ہوں کہ آج برسوں کے بعد ادب کے محسن اور زبان اُردو کی نشو و نما کرنے والے پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہیں۔ اور یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہماری درخواست قبول فرمائی اور جنت میں بھی ہمارے احساسات و جذبات کی پرورش فرمائی

ہے۔ بزم ادب اللہ کے بعد ان لوگوں کا مشکور ہے جو تشریف لائے اور مجلس کو رونق بخشی۔ اُمید ہے کہ اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ باقی نشستوں کو بھی کامیاب بنائیں گے۔ آج کی نشست حضرت امیر مینائی کے اس شعر پر ختم ہوتی ہے:۔

اب تو جاتے ہیں میکدے سے امیر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ایک صاحب اُٹھے اور کہا مصرع ثانی وقت کی مناسبت کے لحاظ سے اگر یوں ہو تو اچھا ہے۔ ؎

اب تو جاتے ہیں میکدے سے امیر
کل ملیں گے اگر خدا چاہا

محفل قہقہوں اور تالیوں سے گونج اُٹھی۔۔۔ حضرت ولی مسکرائے اور فرمایا۔ ایک بات تو کہنا بھول ہی گئے۔ وہ یہ کہ "اگر آپ لوگ ذرا وقت سے پہلے تشریف لے آیا کریں تو مشاعرہ ٹھیک وقت پر ختم ہو جائے آج ہمیں حضرت جب یہیں ہو کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ آپ اس امر کا لحاظ رکھیں گے۔ اچھا خدا حافظ"۔ محفل برخاست ہوئی۔ سامان کی نگرانی کے لئے دو فرشتوں کو متعین فرمایا گیا۔ حضرت ولی عصا ٹیکتے ایک ہجوم کے ساتھ تشریف لے گئے۔

مشاعرہ کی دوسری نشست

مشاعرہ کی پہلی نشست نے ہی دھوم مچادی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی تذکرہ تھا۔ چنانچہ دوسرے دن لوگ جوق در جوق آنے شروع ہوتے۔ آج تو جہنمیوں نے بھی اپنے داروغہ سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہماری خواہش پیش کی جائے کہ ہمیں بھی از راہ کرم مشاعرہ میں شمولیت کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ داروغہ نے حضرت جبرئیلؑ سے ان لوگوں کیطرف سے عرض کی۔ حضرت جبرئیلؑ نے اللہ کے حضور میں درخواست گذاری تو اللہ نے فرمایا۔ ان مسخروں کی گفتگو میں نہ جانے کیا اثر ہے کہ جو سنتا ہے کھچا آتا ہے کل تو فرشتے بھی تڑپ اٹھے۔ اچھا۔

"یہ بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"۔ انھیں کہ مشاعرہ کے دوران میں تھپکے عذاب اٹھایا جائیگا۔ حضرت جبرئیل خوش خوش واپس تشریف لائے

کہ ان کی بات رہ گئی۔ چنانچہ آج ان گنت تعداد میں لوگ آئے اتنے میں شاعروں کی ٹولی خراماں خراماں ایک خاص انداز سے آئی اور صدر کی کرسی کے قریب دو صفوں میں تقسیم ہو کر وہ لوگ بیٹھ گئے۔ لیکن آج ابھی تک کرسی صدارت بے رونق ہے۔ حاضرین کی نگاہیں شمع محفل کے لیے منتظر ہیں۔ جب لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو شعراء میں سے ایک صاحب نے اٹھ کر فرمایا کہ بزم ادب آج کی نشست کے لیے حضرت جان جاناں مظہر کو صدارت کے لیے انتخاب فرماتی ہے بزم ادب کو پوری توقع ہے کہ آپ اس درخواست کو قبول فرمائیں گے۔ حضرت سودا اور میر تقی میر نے اٹھ کر تائید فرمائی۔ حاضرین نے تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ اس اصرار پر حضرت مظہر کو یہ خدمت انجام دینی پڑی۔ حضرت مظہر کے کرسی پر بیٹھتے ہی محفل تالیوں سے گونج اٹھی۔ شعرا کی فہرست جو آج کی نشست میں شرکت فرما رہے ہیں پیش کی گئی۔ حضرت مظہر نے بلند آواز سے فرمایا: حاضرین محفل کی اطلاع کی خاطر بزم ادب اُن شعراء کرام کی فہرست پیش کر رہی ہے۔ جو اس نشست میں شرکت فرما رہے ہیں۔

۱۔ حضرت میر عبدالحی تاباں
۲۔ حضرت مرزا محمد رفیع سودا
۳۔ حضرت خواجہ میر درد
۴۔ حضرت سید محمد میر سوز
۵۔ حضرت میر محمد تقی میر
۶۔ حضرت شیخ قلندر بخش جرأت

۷۔ حضرت میر غلام حسن حسنؔ

۸۔ حضرت سید انشاء اللہ خاں انشاؔ۔

۹۔ حضرت شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

اب ہم حضرت تاباںؔ کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ اس نشست میں اوّلین کا تاج پہنیں۔ حضرت تاباں اپنی جگہ سے اٹھ کر شمع مجلس کے قریب جا بیٹھے۔ حضرت مظہر نے تعارف فرمایا۔ آپ یوسفِ ثانی میر عبدالحی صاحب تاباںؔ سیاہ پوش مرزا صاحب کے مُرید ہیں چونکہ حضرت صاحب بھی موجود ہیں اس لیے ہم حضرت صاحب کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنے منظورِ نظر کو کلام سنانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ اس درخواست پر حاضرین نے تالیوں کے ہنگاموں سے تائید کی چنانچہ حضرت صاحب نے اپنے محبوب شاگرد حضرت تاباں کو اجازت بخشی۔ حضرت تاباںؔ نے اپنی تازہ غزل سنائی۔

غزل

نہیں دوست اپنا یار اپنا مہرباں اپنا — سناؤں کس کو غم اپنا الم اپنا بیاں اپنا

بہت چاہا کہ آوے یار یا اس دل کو صبر آوے — نہ یار آیا نہ صبر آیا دیا جی میں نداں اپنا

قفس میں تڑپے ہی ہیں صیاد یہاں سخت بے بس ہیں — نہ گلشن دیکھ سکتے ہیں نہ یہ اب آشیاں اپنا

مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پر اے تاباںؔ

نہ یار اپنا نہ دل اپنا نہ تن اپنا نہ جاں اپنا

غزل ختم ہو گئی لیکن لوگ سکتہ کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کچھ لمحے گذرنے کے بعد ہر ایک کی زبان پر سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ واہ واکی ہلکی ہلکی صدائیں اٹھیں اور شمع مجلس کے خاموش آنسوؤں میں جذب ہو گئیں۔ شمع مجلس نے اپنے دامن سے آنسو پونچھے اور کہا تخلص کے ساتھ سخن بھی چمکتا ہے۔ ظاہر و باطن میں نور دمکتا ہے۔ حضرت تاباںؔ نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔ حاضرین مجلس نے مزید کلام کے لیے اصرار کیا تاباںؔ خاموش بیٹھے رہے گویا وہ حضرت صاحب کی اجازت کے منتظر ہیں۔ حضرت صاحب نے تاباںؔ سے فرمایا۔ حاضرین کی شوق کی قدر افزائی ہونی چاہیے۔ چنانچہ حضرت تاباںؔ نے اپنی دوسری غزل سنائی۔

غزل

سن فصلِ گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

بیمار ہے زمیں سے اٹھتی نہیں عصا بن
نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں

آئینہ رو برو رکھ اور اپنی چھب دکھانا
کیا خود پسندیاں ہیں کیا خود نمائیاں ہیں

دیکھے سے آئینہ بھی حیراں ہے تیرا رو
چہرے کے بیچ تیرے کیا کیا صفائیاں ہیں

خورشید گر کہوں میں تو جان ہے وہ پہلا
جو مہ کہوں تیرا رو اس پر تو چھائیاں ہیں

جب پان کھا کے پیارا گلشن میں جا ہنسا ہو
بے اختیار کلیاں تب کھل کھلائیاں ہیں

کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے
اب کس کے ساتھ پیارے وے دلربائیاں ہیں

عاشق سے گرم ملنا پھر بات بھی نہ کہنا
کیا بے مروتی ہے کیا بے وفائیاں ہیں

افسوس اے صنم تم ایسے ہوئے ہو ابتر
ملتے تو غیر سے جا ہم سے دکھائیاں ہیں
قسمت میں دیکھیں کیا ہے جیتے رہیں کہ مر جائیں
قاتل سے ہم نے یار و آنکھیں لڑائیاں ہیں
اب مہرباں ہو لے ہے تاباں تیرا ستمگر
آہیں تری کسی نے شاید سنائیاں ہیں

محفل میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہر ایک بس دیکھ رہا ہے۔ بعضوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ حضرت مظہر تکیئے کے سہارے بیٹھے ایک گہری سوچ میں غرق ہیں گویا وجد کی حالت طاری ہے۔ حضرت صاحب نے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ اب چلے جاؤ۔ تمہارے شعر نہیں شعلے ہیں کہ جس تک پہنچتے ہیں جلا دیتے ہیں۔ اب پڑھو گے تو خاک ہو جائیں گے حضرت مظہر نے بھی خوب داد دی اور ہر ایک کے سینے سے سرد آہیں نکل آئیں حضرت تاباں شکریہ ادا کر کے اپنی جگہ واپس لوٹ آئے۔

ان کے بعد مرزا محمد رفیع سودا تشریف لائے تو شمع مجلس نے فرمایا حضرت سودا کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ہم مرزا صاحب سے تازہ کلام کی فرمائش کریں گے۔ اس جملہ پر لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ گویا لطیف انداز میں شمع مجلس کی تائید فرمائی گئی ہے۔

حضرت سودا نے جیب میں سے کاغذ نکالا اور غزل پڑھی۔

غزل

ہو یہ دیوانہ مرید اس زلف چھٹ کس پیر کا
سلسلہ بہتر ہے سودا کے لیے زنجیر کا

زخم دل پاوے میرے سوز سخن سے التیام
چاک ملتا ہے زبانِ شمع سے گل گیر کا

گل میرے مشہد پر کب بھیجے وہ ابرو کماں
طرح غنچے کے کھلے جب تک نہ پیکاں تیر کا

ایکدن تجھ سے سلگ اٹھتا نہ دیکھا کارواں
اے جرس حاصل کچھ اس فریاد بے تاثیر کا

توڑ کر بت خانے کو مسجد بنائی تو نے شیخ
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

اس غزل پر بہت کم لوگوں نے داد دی شاید اس لیے کہ اِس نشست میں میر کے مرید زیادہ ہیں۔ میر کے پاس بھی اس زمین میں غزل تھی فوراً بول اٹھے مرزا صاحب اس زمین میں شعر کہنا سیکھئے۔ صاحب صدر کی اجازت سے میر صاحب نے اپنی غزل پڑھی۔

غزل

صید کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغ جہاں الّا یہ حیراں و خفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

بوئے خوں سے جی رکا جاتا ہی اے بادِ بہار
ہو گیا ہے چاک دِل شاید کسو دلگیر کا

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا

راہ گذر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر — اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا
بس طبیب اٹھ جا میری بالیں سے مت دے دردِ سر — کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا
نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی اس کے در پہ ہم — قدِ خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا
جو ترے کوچے میں آیا پھر وہیں گاڑا اسے — تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاکِ دامنگیر کا
سخت دل ہے جو چھڑی پھولوں کی گوندی ہی وہ لے — فائدہ کچھ اے جگر اس آہِ بے تاثیر کا

کس طرح سے مانیئے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

میر کی غزل پر محفل چمک اٹھی۔ شمع محفل نے فرمایا۔ حضرت سودا اپنی جگہ پر چمک رہے ہیں۔ اندھے کو نظر نہ آئے تو سورج کا کیا قصور۔ اسی طرح حضرت میر اپنے مقام پر منور ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں آہ ہے اور مرزا صاحب کے کلام میں واہ ہے۔ مثال کے طور پر میں دونوں دوستوں کا ایک ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہووے۔

میر صاحب فرماتے ہیں۔ ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں درد ہے سوز و گداز ہے۔ لیکن مرزا صاحب کا شعر جو مجھے پسند ہے ملاحظہ ہووے۔ ؎

سودا کی جو بالیں پہ اٹھا شورِ قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اسی ضمن میں میں کچھ اشعار پیش کرتا ہوں ۔ میر صاحب نے ایک مضمون کو یوں باندھا ہے ۔

چمن میں گل نے جو کل دعوۂ جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

شعر خوب ہے اور بہت خوب ہے اب مرزا صاحب اسی مضمون کو اس رنگ میں پیش کرتے ہیں ۔

برابری کا تیری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

میر صاحب نے شب فراق میں بیداری کا یوں نقشہ کھینچا ہے ۔

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

مرزا صاحب نے دو جگہ اسی مضمون کو باندھا ہے ۔

سوداؔ تیری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

اور دوسرا شعر یہ ہے

ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھ کو نیند
جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں

محفل میں قہقہوں اور تالیوں کا وہ شور اٹھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دی ۔

شمع مجلس نے بڑی مشکل سے حاضرین کو خاموش کیا اور فرمایا - چونکہ محفل میں حضرت میر - حضرت جرأت حضرت سودا اور حضرت مصحفی بھی تشریف فرما ہیں میں نہیں چاہتا کہ چشمکیں کی رسم طول پکڑ جائے اس لیے میں خود ہی ان بزرگوں کا کلام پیش کیے دیتا ہوں اس سے ایک لطف پیدا ہو جائے گا - لیجیے ملاحظہ ہو وے ؎

برقعہ کو اٹھا چہرہ سے وہ بت اگر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے — میر

اس دل کو تفِ آہ سے کب شعلہ بر آئے
بجلی کو دم سرد سے جس کے حذر آئے — سودا

ہرگز نہ مرادِ دل معشوق بر آئے
یا رب نہ شب وصل کے پیچھے سحر آئے — مصحفی

اس پردہ نشیں سے کوئی کس طرح بر آئے
جو خواب میں بھی آئے تو منہ ڈھانک کر آئے — جرأت

اس موازنہ پر وہ شور اٹھا کہ شعر مشکل سے سنائی دیا اس کے بعد شمع مجلس نے کچھ اور شعر پیش کیے -

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہونگے تو بہت یاد کرو گے

میر

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے — سودا

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کروگے
لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے — جرأت

اِس موازنہ پر پھر وہی شور اُٹھا اور واہ وا کی صدائیں بُلند ہوئیں۔ شمع مجلس نے کچھ اور اشعار پیش کیے۔

مدّعی مجھ کو کھڑے صاف بُرا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں — میر

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں — سودا

آئینہ رخ کو تیرے اہلِ صفا کہتے ہیں
اس پہ دل اٹکے ہے میرا اسے کیا کہتے ہیں — جرأت

پھر محفل میں خوب ہے بہت خوب کی صدائیں بلند ہوئیں۔ شمع مجلس نے فرمایا آپ نے ان بزرگوں کا کلام ملاحظہ فرمایا ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی کو کم کہیں کیونکہ ہر ایک اپنے انداز کا بادشاہ ہے۔

اس کے بعد شمع مجلس نے حضرت مرزا سودا کی خدمت میں درخواست گذاری کہ اگر کچھ اور یاد ہو تو سنایئے ابھی جی نہیں بھرا۔ مرزا صاحب نے یہ

تکمیل ارشاد عرض کی۔ قبلہ ایک غزل کے تین شعر یاد ہیں۔ ارشاد ہو تو عرض کروں۔ شمع مجلس نے فرمایا۔ شوق سے محفل سراپا گوش ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے سوز و گداز میں غرق ہو کر ہلکی سی آواز میں یہ شعر پڑھے۔

گر کیجیے انصاف تو کی زور وفا میں
خط آتے ہی سب ٹل گئے اب آپ ہیں نا ہیں

تم جن کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے ان کی
لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

جب مرزا صاحب نے مقطع کہا تو میر صاحب نے فرمایا۔ میرے سینے کی تمام آہیں اس مقطع میں پوشیدہ ہیں۔ مرزا صاحب آداب بجا لائے۔ خوب تالیاں بجائی گئیں۔ واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے اور مرزا صاحب اپنی جگہ پر تشریف لے جانے لگے تو محفل سے اور فرمائش ہوئی۔ مجبور ہو کر پھر پلٹ آئے اور دو چار شعر سنائے۔ ؎

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

؎ دل کو تو ہر طرح سے دلاسا دیا کروں
آنکھیں جو مانتی نہیں ان کو میں کیا کروں

؎ موجِ نسیم آج ہے آسودہ گرد سے
دل خاک ہو گیا ہے کسی بیقرار کا

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
ٹپکا تیری آنکھوں سے کبھی لختِ جگر بھی

شعر سنانے کے بعد اقلیم سخنوری کے شہنشاہ۔ اُردو کے خاقانی و انوری سپہر شاعری کے درخشندہ ستارے ریختہ گویوں کے انتخاب، قصیدہ اور ہجو کے موجد حضرت سوؔدا داد و تحسین کی بلند آوازوں کو چیرتے ہوئے اپنی جگہ پر تشریف لے گئے۔ اِن کے بعد حضرت میر دردؔ تشریف لائے۔

شمع مجلس نے آپ کا تعارف فرمایا کہ آپ حضرت خواجہ میر درد صاحب ہیں یعنی اُردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن۔ آپ اکثر چھوٹی چھوٹی بحروں میں غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آب داری نشتروں میں بھر دیتے ہیں۔ اگر حضرت میرؔ نے غزل کا رتبہ آسمان پر پہنچایا ہے تو حضرت دردؔ نے تصوف کی چاشنی دے کر غزل میں درد پیدا کیا ہے۔ در اصل آپ جمالِ حقیقی سے آشنا۔ جام معرفت سے سرشار اور تصوف کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ آپ کی غزلیں پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے حضرت دردؔ کے کلام سے ایک خاص عقیدت ہے اور وہ شعر جو وظیفہ ہیں آپ بھی سنیئے۔

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہو گا

دل بھی اے دردؔ قطرہ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہو گا

ے زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ے اس طرح جی میں سانس کھٹکے ہے
سانس ہے یا کہ پھانس کھٹکے ہے

ے ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

یہ ہیں وہ نشتر کہ زخم کئے بغیر نہیں رہتے اب میں حضرت درد کی خدمت میں درخواست گذارتا ہوں کہ آپ اپنے نشتروں سے زخمہائے جگر کو چھیڑ کر ایک میٹھا سا درد پیدا کر دیں۔

محفل تالیوں سے گونج اٹھی حضرت درد نے کاغذ نکالا محفل خاموش ہو گئی اور جناب درد نے پڑھنا شروع کیا۔

ابھی ایک شعر بھی پورا نہ کیا تھا کہ حاضرین نے درخواست گذار دی کہ اگر خواجہ صاحب گستاخی معاف فرمائیں تو عرض کریں۔ ہمیں بیحد اشتیاق ہے کہ حضور اپنے ذوقِ موسیقی سے بھی محفل کو لطف اندوز فرمائیں۔ چنانچہ شمع مجلس نے بھی اصرار فرمایا۔ خواجہ صاحب محفل کے اصرار پر مجبور ہو گئے اور اپنے خدمتگذار سے ایک ساز طلب فرمایا۔ خدمتگذار نے ساز حاضر کیا۔ ساز چھیڑا ہی تھا کہ شاہ عالم بادشاہ محفل میں تشریف لے آئے۔ اتفاقاً بادشاہ کے پاؤں میں تکلیف سی ہے اس لیئے ذرا پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ حضرت درد نے کہا۔ یہ امیر فقیر کے ادب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا

کہ معاف کیجئے۔ عارضہ سے معذور ہوں۔ حضرت دردؔ نے کہا عارضہ تھا تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بادشاہ نے معافی چاہی اور اٹھ کر چلے گئے ان کے جانے کے بعد حضرت دردؔ نے ساز سنبھالا اور غزل شروع کی۔

غزل

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا ــــ پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما ــــ اس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
کیوں بھویں تانتے ہو بندہ نواز ــــ سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا ــــ کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم ــــ نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
آپ سے ہم گذر گئے کب کے ــــ کیا ہی ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ ــــ خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا ــــ جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے دردؔ
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

غزل سن کر محفل پر ایک وجد طاری ہو گیا صاحب صدر الگ سر دُھن رہے ہیں کچھ وقت کے بعد ہوش آیا تو زبان پر واہ وا۔ واہ وا۔ تھا۔ محفل نے ایک غزل اور کہنے کے لیے اصرار کیا۔ حضرت دردؔ نے دوسری غزل

شروع کی سے

غزل

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہو گیا
کس کی نظر لگی جو یہ بیمار ہو گیا

کچھ ہے خبر تجھے بھلی کہ اٹھ اٹھ کے رات کو
عاشق تیری گلی میں کئی بار ہو گیا

بیٹھا تھا خضر آ کے میرے پاس ایک دم
گھبرا کے اپنی زیست سے بیزار ہو گیا

چاک جگر تو سینکڑوں خاطر میں کچھ نہ تھے
دل کی طپش کے آگے میں ناچار ہو گیا

کھٹکے کبھو دلوں میں نہ تیری صدا جرس
نالہ میرا تو چھوٹتے ہی پار ہو گیا

اے درد ہم سے یار ہے اب تو ساوگ ہیں
خط زخم دل کو مرہم زنگار ہو گیا

حضرت درد کے کلام میں فی الحقیقت ایک جادو ہے جس کا اثر سوز و گداز ہے اور موسیقی اس پر سونے پر سہاگہ ہے۔ واقعہ حضرت درد کو جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا۔ حضرت درد کو ہر شخص نے داد دی۔ شمع مجلس نے بہت سراہا ان کے بعد حضرت میر سوز کی خدمت میں درخواست گذاری گئی۔ وہ اٹھے اور جھکتے ہوئے شمع مجلس کے قریب آن بیٹھے اور صاحب صدر نے ان کا تعارف فرمایا "آپ حضرت سید محمد میر سوز جو کہ قبلہ میر صاحب تراز دِ نگاہ ہیں یاد بھر وزن رکھتے ہیں۔ آپ کی طبع موزوں کے آئینے کو فصاحت نے صفائی سے جلا کی ہے اور ظرافت نے جوہر پیدا کئے ہیں۔ آپ کی میٹھی زبان

غزل کی جان ہے اور اس خوش نمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دھرا ہے اور سرسبز پتیوں میں اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے۔ آپ کو اگر اردو غزل کا سعدی کہیں تو بیجا نہ ہوگا" تعارف ختم ہونے پر حاضرین کی تالیوں کے شور سے محفل چمک اٹھی۔ صاحب صدر نے محفل کو خاموش کیا اور حضرت سوز کی خدمت میں کلام پیش کرنے کی التجا کی۔

حضرت سوز نے جیب میں سے کاغذ نکالا اور پہلے ایک قطعہ پڑھا اور اس انداز سے سنایا کہ سارے مشاعرے کے لوگ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے سے

او مارِ سیاہ زلف سچ کہہ   بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے   کاٹا نہ ہنسیَ تیرا بُرا ہو

پہلے مصرع پر ڈرتے ڈرتے نیچ کر جھکے گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں۔ اور جس وقت کہا۔ کاٹا نہ ہنسیَ! بس دفعتاً ہاتھ کو چھاتی تلے محسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد غزل پڑھی اور وہ بھی اسی انداز سے ادا کی۔

غزل

میرا جان جاتا ہے یارو بچالو   کلیجہ میں کانٹا گڑا ہے نکالو
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی   مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو
خدا کے لیے میرے اے ہمنشینو   وہ بانکا جو جاتا ہے اسکو بُلالو
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے   تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو

نہ آوے اگر وہ تمہارے کہے سے — تو منت کرو گھیرے گھیرے منا لو
کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے — اسے جان کندن سے چل کر بچا لو

جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

پہلے مصرع پر کلیجہ کو تھام کر اپنے اوپر ایسی کیفیت طاری کی کہ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور دوسرے مصرع پر آواز کو یوں دبا کر نکالا کہ گویا دم گھٹ رہا ہے اور تکلیف ناقابلِ برداشت ہے۔ لوگوں نے گھبرا کر ہاتھ بڑھائے۔ دوسرے شعر پر انکساری ظاہر کرتے ہوئے اس انداز سے سر اور ہاتھ ہلائے کہ سب کو رحم آگیا اور دوسرے مصرع پر ایک طرف کو جھکے اور تھراتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو" تیسرے شعر پر تڑپ کر ایک جانب کو ہاتھ اٹھایا اور نگاہیں اٹھا کر کہا۔ وہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلا لو۔ سب لوگ اس طرف دیکھنے لگے۔ بعض تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ باقی شعر بھی اسی انداز سے ادا کئے۔ یہ انداز بیان ان میں خاص جوہر ہے جس سے محفل پر چھا جاتے ہیں۔ غزل کے خاتمہ پر وہ شور اٹھا کہ محفل گونج اٹھی۔ محفل میں ایک صاحب نے کہا آپ نے سوز کیا تخلص رکھا ہے، ہمیں پسند نہیں۔ میر صاحب نے جواب میں کہا۔ فقیر نے تخلص تو میر کہا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام روشن نہ ہو سکے گا ناچار سوز تخلص کیا۔ شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا "سنتا ہوں یہ صاحب گوز کرتے ہیں"۔ مشاعرہ میں عجیب

قہقہہ اڑا اور وہ شخص چپ ہوگیا۔

ان کے بعد حضرت میر محمد تقی میر تشریف لائے۔ آپ کی تشریف آوری پر خوب تالیاں بجائی گئیں چونکہ غزل میں آپ استاد مانے گئے ہیں۔ اس لیئے ہر ایک شخص آپ کا کلام سننے کا اشتیاق رکھتا ہے۔ صاحب صدر نے آپ کا تعارف فرمایا۔ " آپ حضرت میر محمد تقی میر زبانِ فارسی کے معتبر مصنف اور مسلّم الثبوت محقق اور زبان اُردو کے چھ آسمانوں کے بادشاہ۔ سوز و گداز کے آدم ہیں، شاعروں کے سرتاج اُردو شاعری کے استادِ اعظم ہیں۔ جس طرح فنِ منطق کا بانی مبانی ارسطو کو مانا جاتا ہے۔ اُسی طرح فن غزل گوئی کا پہلا استاد میر صاحب کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ وارداتِ قلب و محبت کی ترجمانی آپ سے بہتر کسی نے نہ کی اور نہ کوئی کریگا۔ عشق کی کیفیات کو آپ سے بہتر کسی نے نہیں سمجھا۔ چنانچہ آپ کے بہتر نشتر مشہور ہیں اور باقی تبرک۔ اب میں بزم ادب کی طرف سے حضرت میر سے پرزور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے کلام سے محظوظ فرمائیں حاضرین نے خوب زور شور سے تالیاں بجائیں۔ جناب میر نے کاغذ نکالا اور غزل کہی۔

غزل

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں　　دل کلیجہ نکال لیتے ہیں

کیا نظر گاہ ہے کہ شرم سے گل　　سر گریباں میں ڈال لیتے ہیں

دیکھ اسے ہو ملک سے بھی لغزش　　ہم تو دل کو سنبھال لیتے ہیں

کھول کر بال سادہ رو لڑکے — خلق کا کیوں وبال لیتے ہیں
تیغ کھینچے ہیں جب یہ خوش ظاہر — ماہ و خور منہ پہ ڈھال لیتے ہیں
دلبراں نقد دل کو عاشق کے — جان کر اپنا مال لیتے ہیں
ہیں گدا میرؔ بھی ولے دو جہاں
کر کے ایک ہی سوال لیتے ہیں

غزل کے ایک ایک شعر پر داد ملی صاحب صدر نے ایک ایک مصرع کو سراہا۔ شمع مجلس لے دوسری غزل کے لئے فرمائش کی بہ تکمیل ارشاد حضرت میر نے دوسری غزل سنائی۔

غزل

عمر بھر رہے ہم شرابی سے — دل پُر خون کی اِک گلابی سے
جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ — رات گذرے گی کس خرابی سے
کِھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
بُرقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا — داغ ہوں اس کی بے حجابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

غزل بہت پسند کی گئی۔ خوب داد ملی ایک ایک مصرع پر واہ واہ کا شور اٹھا

اور فضاؤں سے ٹکراتا رہا۔ ان کے بعد حضرت جرآت تشریف لائے۔ لیکن حضرت سودا اٹھے اور شمع محفل سے ایک شعر پڑھنے کی اجازت چاہی چنانچہ میر پر یہ شعر پڑھا۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

حضرت میر جو ابھی شمع محفل کے قریب ہی تشریف فرما تھے بولے

طرف ہونا میرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

شمع محفل نے جانچ لیا کہ معاملہ بڑھ رہا ہے فرمایا "دوستو! ان باتوں سے کیا حاصل! ہمیں افسوس ہے کہ حضرت سودا خواہ مخواہ اُلجھ جاتے ہیں۔ انکے دل سے پوچھئے کہ حضرت میر کے کلام کا کیا مرتبہ ہے ہم تو اسے سودائی سمجھتے ہیں جو میر کی میری کا معتقد نہ ہو۔ اور پھر یہ چیزیں اچھے لوگوں کو زیبا نہیں دیتیں۔ آؤ گلے ملو ایک شہر کے رہنے والے ہو جو باہر سے احباب آئے ہیں وہ کیا اثر لیکر جائیں گے!" اس نصیحت نے دونوں کے دلوں پر ایک گہرا اثر کیا دونوں اٹھے اور گلے ملے۔ لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ مشاعرہ کا پہلو بدلنے کے لیے حضرت جرآت نے کاغذ نکالا لوگ ادھر متوجہ ہو گئے۔ حضرت جرآت نے غزل شروع کی۔

غزل

نہ جواب لے کے قاصد جو پھر اشتاب الٹا
میں زمیں پہ ہاتھ مارا بصد اضطراب الٹا

دم وصل اُس نے رخ سے جو نہ ٹک نقاب اُلٹا
ہمیں لگ گیا دم اس دم بصد اضطراب الٹا

ترے دور میں ہوئے کش کوئی مے گیا فلک کے تیری
وہ ہے شکل جوں بھرا ہو قدح شراب الٹا

یہ نہ فاکی میتے قسیر مجھے کہتے بیوفا ہو
میری بندگی ہے صاحب ملا خطاب الٹا

میرے بخت ہیں وہ روکش کہ وہ ذکر جو وعدہ شب
تو پہنچ کے تا بمغرب پھرے آفتاب الٹا

کسی نسخہ میں پڑھے تھا وہ مقام دلنوازی
مجھے آتے جوں ہی دیکھا ورق کتاب الٹا

وہ بہک کے کاسہ سر میرے خوں میں شکل کشتی
کہے ہے کہ دیکھو نکلا یہ ہوا حباب الٹا

میرے دل نے داغ کھایا جو یہ لوئے سوختہ سے
یہ جلا بس ایک پہلو نہ گیا کباب الٹا

غزل اور پڑھ تو جرات کہ گیا جو یاں سے گھر کو
تو کلام سنتے تیرا ہیں پھر اشتاب الٹا

غزل عمدہ ہے خوب داد ملی صاحب صدر نے غزل کو سراہا۔ حضرت جرات بہت خوش ہوئے اور دوسرا کاغذ جیب سے نکال کر دوسری غزل پڑھنی شروع کی۔

غزل

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

کیسار کے دیکھے بھی جو ٹک اس سی لگ چلو
بس بس پھرے ہو شوق یہ اپنے نتس نہیں

پہلو میں کیا کہیں جگر و دل کا کیا ہو رنگ — کس روز اشکِ خونی سے تر آستیں نہیں
فرصت جو پا کے کہیے کبھو دردِ دل سو ہائے — وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں
آتش سی پھک رہی ہے میرے تن بدن میں آہ — جب سے کہ روبرو وہ رُخِ آتشیں نہیں
اُس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی — گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ دل — یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں
سنتا ہے کون کس سے کہوں دردِ بیکسی — ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہمنشیں نہیں
ہر چند ہے بہ لطفِ شبِ ماہ سیرِ باغ — اندھیر ہے یہی ہے کہ وہ مہ جبیں نہیں
آنکھوں کی راہ نکلے ہے کیا حسرتوں سے جی — وہ رُوبرو جو اپنے دمِ واپسیں نہیں
طوفانِ گریہ کیا کہیں کس وقت ہمنشیں — موجِ سرشک تا فلکِ ہفتمیں نہیں

حیرت ہے مجھ کو کیونکہ وہ جرأت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

اس غزل کے مطلع پر ہی وہ شور اٹھا کہ دوسرا شعر مشکل سے سنائی دیا صاحبِ صدر نے بڑی مشکل سے حاضرین کو خاموش کیا اور مطلع پھر کہوایا گیا۔ اسی طرح ساری غزل ختم ہوئی۔ محفل کے اصرار پر وہ غزل پڑھی جس کا مطلع ہے۔ ع

امشب کسی کاکل کی حکایات ہے واللہ

غزل

امشب کسی کاکل کی حکایات ہے واللہ — کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

دل چھین لیا اُس نے دکھا دستِ حنائی | کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ
عالم ہے جوانی کا جو ابھرا ہوا سینہ | کیا گات ہے کیا گات ہے کیا گات ہے واللہ
دشنام کا پایا جو مزہ اس کے لبوں سے | صلوات ہی صلوات ہی صلوات ہے واللہ

جرأت کی غزل جس نے سنی اُس نے کہا واہ
کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

اس غزل کے ایک ایک شعر پر وہ قہقہے اُڑے کہ لوگ لوٹ لوٹ گئے۔ شمع مجلس نے ساری غزل ہنستے ہوئے سنی۔ اور خوب داد دی مگر میر صاحب خاموش بیٹھے رہے اور داد نہ دی حضرت جرأت اٹھے اور میر صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور کہا۔ حضرت! اگرچہ آپ کے سامنے غزل پڑھنی بے ادبی اور بے حیائی ہے مگر خیر اس بیہودہ گوئی جو یاوہ گوئی کی آپ نے سماعت فرمائی۔ میر صاحب تیوری چڑھا کر چپکے ہو رہے جرأت نے پھر کہا میر صاحب کچھ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے جب انھوں نے بہ تکرار کہا تو میر صاحب نے فرمایا۔ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔" یہ کہنا تھا کہ مجلس قہقہوں سے گونج اٹھی اور حضرت جرأت خاموش ہو کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے۔ ان کے بعد حضرت حسن کو ارشاد فرمایا گیا وہ تشریف لائے۔ تو شمع مجلس نے آپ کا تعارف فرمایا۔

"آپ خندہ جبیں۔ شگفتہ مزاج۔ ظریف طبع۔ حضرت میر غلام حسن صاحب حسن ہیں۔ آپ کی تصنیف "بدرِ منیر" کلام کی عمدگی۔ صفائی بیان۔ لُطفِ محاورہ اور شوخیٔ مضمون و طرزِ ادا کی بین شہادت ہے۔ اس وقت آپ غزل ارشاد

فرمائیں گے جس کی نقل پہلے بھیج چکے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے۔

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیئے
انصاف کر تو چاہیئے پھر یا نہ چاہیئے

اور دوسری غزل کا مطلع ہے ؎

یہ ترفہ تر کہ تیری سنبھلتی نہیں زباں
اور تیرے سامنے میری چلتی نہیں زباں

لوگوں نے تالیوں سے خیر مقدم کیا حضرت حسنؔ نے جیب میں سے کاغذ نکالا غزل پڑھنی شروع کی۔

غزل

جو چاہے آپ کو تو اسے کیا نہ چاہیئے
انصاف کر تو چاہیئے پھر یا نہ چاہیئے

مجھ ایسا تجھ کو چاہے نہ چاہے عجب نہیں
مجھ سا جو چاہے مجھ کو تو پھر کیا نہ چاہیئے

کس کو سنا کے کہتے ہو میں چاہتا نہیں
اب کیوں جی ہم برے ہوئے اچھا نہ چاہیئے

گر پاس تیرے بیٹھوں تو معذور رکھ مجھے
جس جا پہ شمع ہووے تو پروانہ چاہیئے

عیش وصال و صحبت یاراں فراغ دل
اس ایک جان کے لیے کیا کیا نہ چاہیئے

دیتے ہو تم دکھائی جو ہمراہ غیر کے
اس طرح سے غرض تمھیں دیکھا نہ چاہیئے

اب جیسے اک حسنؔ سے ہنسے تھے تو ہنس لیے
پر اس طرح ہر ایک سے ٹھٹھا نہ چاہیئے

غزل کا ایک ایک شعر عمدہ ہے ایک ایک مصرع پر داد ملی اور صاحبِ صدر نے تمام غزل نہایت غور سے سنی اور بہت سراہا۔ اس کے بعد حضرت حسن نے دوسری غزل پڑھی۔

غزل

یہ طرفہ تر کہ تیری سنبھلتی نہیں زباں
اور تیرے سامنے میری چلتی نہیں زباں

میرا تو دل جلا تیری باتوں سے شمع رُو
تو بھی دیکھ کیا تیری چلتی نہیں زباں

کل عہد کچھ کیا تھا دیا قول آج کچھ
پھر کہیو تو کہ میری بدلتی نہیں زباں

سرگرم سوز عشق رہے ہے یہ مثلِ شمع
تن گھس گیا ہے اور پگھلتی نہیں زباں

سو سو طرح سے کرتا ہوں تقریر میں حسن
عہدہ سے حالِ دل کے نکلتی نہیں زباں

غزل کے دوسرے شعر پر ساری محفل پکار اُٹھی کہ گرمی گفتار کی تعریف اس سے بہتر نہ ہو سکے گی اور محبوب کو جس انداز سے کوسا گیا ہے یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ شمع محفل نے فرمایا۔ حسن صاحب! دونوں غزلیں نہایت عمدہ ہیں۔ غزل ثانی کا شعر اوّل تو کبھی نہ بھولے گا۔ حسن صاحب نے قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا اور اپنی جگہ پر تشریف لے گئے۔ ان کے بعد حضرت انشا تشریف لائے۔ شمع محفل نے آپ کا تعارف فرمایا۔ آپ آسمانِ شاعری کے درخشاں ستارے ہیں۔ آپ کا نام گرامی محتاج تعارف نہیں ہے۔ سید انشا کو کون

نہیں جانتا جن کو امرا اور بادشاہوں نے سر پر بٹھایا اور پھر اپنے پاؤں تلے رگڑ دیا۔ سید انشا صاحب بہ حیثیت ادیب اور شاعر کے بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ایجاد و اختراع کے میدان میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں آپ کا کوئی نظیر نہیں ہے۔ اب آپ کا کلام سنیئے اور لطف اٹھائیے" حضرت انشا نے کاغذ نکالا حاضرین نے تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ حضرت انشا نے ایک مخمس کا مطلع پڑھا جو مرزا عظیم بیگ پر چوٹ ہے۔ اتفاق سے وہ بھی محفل میں تشریف فرما ہیں۔ باہمی چشمکیں دیکھئے اور مزے لے لے کے سنیئے۔

مطلع

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے — کہیو عظیم بیگ سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے — پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کر بحر رمل چلے

جلسہ میں وہ قہقہہ اڑا کہ آخری مصرع مشکل سے سنائی دیا۔ مرزا عظیم بیگ چمک اُٹھے اور اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بولے۔

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق — تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق — شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

مرزا اعظم بیگ صاحب نے چونکہ یہ بند فی البدیہہ کہا اس لیے انکی بہت تعریف ہوئی۔ کچھ لوگوں نے محض اس خیال سے مرزا صاحب کو اچھالا کہ دونوں حریف اور چمک جائیں۔ سید انشا اللہ کسی کو کب خاطر میں لاتے۔ اب انکے طائر فخر کی بلند پروازی اور بھی زیادہ ہوئی اور اٹھ کر فرمایا یہ میرا اور ان لوگوں کا کلام ایسا ہے جیسے کلام الٰہی اور مسیلمہ کذاب کا الفیل ما الفیل.. لوگ ہنس پڑے اور مرزا صاحب کچھ مدھم سے پڑ گئے۔ سید انشا صاحب نے ایک فی البدیہہ غزل پڑھی جس کا ہر شعر دلوں پر توپ گولہ کا کام کرتا ہے۔

غزل

ے طفل دبستاں ہیں غلاطوں میرے آگے
کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں میرے آگے

یسا مال بھلا قصر فریدوں میرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبدِ گردوں میرے آگے

غان اولی آجنحہ مانند کبوتر
کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں میرے آگے

دل وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں میرے آگے

ہ دیکھو تو نقارچی بیلِ فلک بھی
نقارے بجا کر کہے دوں دوں میرے آگے

لے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں میرے آگے

رے کو میرے خسرو و پرویز ہو حاضر
شیریں بھی کہے آکے بلدلوں میرے آگے

یا آکے ڈراوے مجھے زلفِ شبِ یلدا
ہے دیو سفید سحر ہی جوں میرے آگے

کیا مار فلک کاہکشاں نام ہے جس کا
کیا دخل جو بل کھا کے کرے غوں میرے آگے

غزل کے ایک ایک شعر پر لوگ لوٹ لوٹ گئے۔ کچھ متنفر بھی ہوئے۔ مشاعرہ میں میر قدرت اللہ خاں بھی موجود ہیں۔ ان کے طرفدار بھی تشریف فرما ہیں۔ غلطی سے حکیم صاحب نے یہ سمجھا۔ کہ سید صاحب نے میری ہجو کہی ہے چنانچہ ان کے طرفدار تن کر بیٹھ گئے۔ مرزا عظیم بیگ صاحب نے اٹھ کر ایک بند پڑھا۔

عظیم گو اب ہمیشہ سے ہی یہ شعر کہنا شعار اپنا
طرف ہر ایک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا

کسی سخن باز کھنڈ گویوں میں ہو نہ ہو اعتبار اپنا
جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں دیا نہیں کو وقار اپنا

عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ٹالا جو بار اپنا

حضرت انشاء نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی ایک غزل پڑھی۔

غزل

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب الٹا

عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب الٹا

یہ شبِ گذشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب الٹا

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ
جو زمیں پہ پھینک مارے قدحِ شراب الٹا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ہوئے عذر پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اے لو دیکھو کچھ تماشا یہ سنو عتاب الٹا

کھڑے چپ ہوئے دیکھتے کیا میرے دل اجڑ گئے کو   وہ گنہ تو کہہ دو جس سے یہ دہ خراب الٹا

غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیونکہ انشاؔ
کہ ہوا نے خود بخود آ ورقِ کتاب الٹا

ایک غزل عمدہ دوسرے پڑھنے والے انشا قیامت کیوں نہ بپا ہو۔ فلک بوس قہقہوں سے داد ملی۔ وہیں حضرت مصحفی اور جرات بھی تشریف فرما تھے باہمی چشمکوں اور انشاء کی بے طرح شوخیوں سے بگڑے بیٹھے تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ یہ صاحب بھی اسی زمین پر غزل کہہ کر لاتے ہوتے ہیں۔

پہلے حضرت مصحفی نے بہ اجازت شمع محفل اپنی غزل پڑھی۔ لوگ سمجھ گئے کہ نکتہ چینی کی عینکیں لگ گئیں۔

غزل

جو پھرا کے اپنے منہ کو بقضا نقاب الٹا   ادھر آسمان الٹا ادھر آفتاب اُلٹا
سرِ شام اس نے منہ سے جو رُخِ نقاب الٹا   نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب الٹا
لب سوالِ بوسہ اس نے مجھ کو رک کے دی جو گالی   میں ادب کے مارے اسکو نہ دیا جواب الٹا
کہیں چشم مہر اس پر تو نہ پڑ گئی ہو یارب   جو نکلتے صبح گھر سے وہ پھرا شتاب الٹا
کسی مست کی لگی ہے مگر اس کے سر کو ٹھوکر   جو پڑا ہے میکدہ میں یہ خمِ شراب الٹا
تر تشنہ لب جہاں سے جو گیا لحد پر اس کی   پس مرگ بھی کسی نے نہ سبوئے آب الٹا
مرے دم الٹنے کی جو خبر اس کو دی کسی نے   وہیں نیم رہ سے قاصد بصد اضطراب الٹا

سرِ لوح اس کی صورت کہیں لکھ گیا تھا مانی
اُسے دیکھ کر نہ میں نے ورقِ کتاب الٹا

میں عجب یہ رسم دیکھی مجھے روزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

یہ نقاب پوش قاتل کوئی زور ہی کہ جس نے
کئے خون سینکڑوں اور نہ ذرا نقاب الٹا

تیرے آگے مہرِ تاباں ہے زمیں پہ سر بسجدہ
یہ ورق کا گنجفہ کے نہیں آفتاب الٹا

یہ مقام آفریں ہے کہ بزور مصحفیؔ نے
انہی قافیوں کو پھر بھی بصد آب و تاب الٹا

حضرت مصحفی مانے ہوئے استاد ہیں غزل بے عیب ہے ایک ایک شعر پر داد ملی اور سید انشاء صاحب ایک ایک حرکت کو محسوس کرتے گئے ان کے بعد حضرت جرأت نے بہ اجازت شمع محلس اپنی غزل پڑھی۔ اور ہر شعر پر سید صاحب کی طرف اشارہ کرتے گئے۔ لوگوں کو تماشا ہاتھ آیا اور خوب قہقہے اڑے۔

غزل

میں تڑپ کے سنگِ تربت بصد اضطراب الٹا
میری قبر پر وہ آکر جو پھر آفتاب الٹا

میرے سو سوال سن کر وہ رہا خموش بیٹھا
نہیں یہ بھی کہنے کی جا کہ ملا جواب الٹا

جو رکھے ہے بخت واژوں وہ غنی سے مل ہو مفلس
کہ ہے یہ آب دریا قدح حباب الٹا

ہمیں ہے خیال اسکا کہ جو آیا خواب میں وہ
تو زباں پہ آنکی ڈرے نہ نہ ہمنے خواب الٹا

اسی ور تک آتے وہ نگاہیں کہ نہیں ہی لکھے میں
مجھے پھیرتے عبث ہو نرہ عتاب الٹا

طلب اس سے کل جو مے کی تو بھرا ہوا زمیں پہ
مجھے شوخ نے دکھا کر قدح شراب الٹا

جو کنار مقصد اپنی لگے بہہ کے ناؤ گل ہے
تو ہوا تھپیڑ مارے لگے بہنے آب الٹا

کسی تذکرہ میں پڑھنے میرے شعر جو گیا وہ
تو ہوائے دوں ہی جرات ورق کتاب الٹا

حضرت جرات پہلے بھی حاضرین کی نظروں میں عزت حاصل کر چکے تھے۔ اس غزل نے ان کی شہرت پر چار چاند لگا دیے۔ واہ وا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ شمع مجلس نے مناسب داد دی حضرت جرات آداب بجا لائے اور بیٹھ گئے۔ پھر حضرت انشا نے ایک ایسی غزل پڑھی کہ سب نے ہاتھ سے غزلیں رکھ دیں کہ اب پڑھنا بیکار ہے۔

غزل

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا،
لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نکل کے وادیِ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقہ لیلا

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے وا دیلا

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

اس غزل نے کچھ ایسا اثر کیا کہ سب کے دلوں سے خود بخود رنجشیں دور ہونے لگیں - چنانچہ ولی اللہ محب نے اٹھ کر یہ قطعہ پڑھا ۔ ؎

مجلس میں چکے چاہیئے جھگڑا شعراء کا — ایسے کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا — اکبر تیئں یا شاہ جہانگیر کے آگے

حکیم میر قدرت اللہ خاں نے اُٹھ کر کہا - ہمارے دل تو آئینہ کی طرح صاف ہیں لیکن ذرا اس الفیل مالفیل کو بھی ملاحظہ فرمائیے - اب شمع مجلس کو خیال ہوا کہ مبادا شرفاء میں بے لطفی حد سے بڑھ جائے - اسی وقت اٹھے اور دونوں میں صلح کروا دی - سید انشا نے بھی شرافت خاندانی اور علّو حوصلہ کا کام کیا - اٹھ کر حکیم صاحب کے گلے لپٹ گئے اور کہا کہ " حضرت حکیم صاحب آپ میرے نبی عم - اس پر صاحب علم صاحب فضل خاک بدہنم بھلا آپ پر طنز کروں گا - البتہ مرزا عظیم بیگ سے شکایت ہے کہ وہ خواہ مخواہ بد دماغی کرتے ہیں اور داد دینی تو درکنار شعر پر سر تک نہیں ہلاتے آخر کس برتے پر "، میر مشاعرہ نے مرزا صاحب کو بلایا اور دونوں میں صلح کروا دی غرض کہ سب کی صلح پر خاتمہ ہو گیا -

ان کے بعد حضرت مصحفی تشریف لائے اگرچہ سب نے دل صاف کر لیے لیکن مصحفی صاحب کے دل سے کدورت نہ گئی کیونکہ انھیں انشا کی حرکت سخت ناگوار گذری - کاغذ نکالا اور تیوری چڑھا کر بیٹھ گئے - غزل پڑھی اور اس انداز سے کہ سمجھنے والے سمجھ گئے ۔

غزل

سر مشک کا ہے تیرا نو کافور کی گردن
تے موے پری ایسے نہ حور کی گردن

مچھلی نہیں ساعد میں تیرے بلکہ نہاں ہے
وہ ہاتھ میں ماہیِ سقنقور کی گردن

یوں مرغ دل اس زلف کے پھندے میں پھنسا ہے
جوں رشتہ صیاد میں عصفور کی گردن

دل کیوں کہ پری حور کا پھر اس پہ نہ پھسلے
صانع نے بنائی تیری بلور کی گردن

ایک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی مزا ہے
اور دوسرے میں ساقیِ مخمور کی گردن

ہر چند میں جھک جھک کے کیے سینکڑوں مجرے
پر خم نہ ہوئی اس بتِ مغرور کی گردن

کیا جانیے کیا حال ہوا صبح کو اس کا
ڈھلکی ہوئی تھی شب تیرے رنجور کی گردن

یوں زلف کے حلقے میں پھنسا مصحفیؔ ای وائے
جوں طوق میں ہووے کسی مجبور کی گردن

محفل میں حضرت مصحفی کے بہت سے شاگرد بھی بیٹھے ہیں۔ انھیں بھی استاد کا رنگ دیکھ کر جوش آ گیا چنانچہ منتظر نے اٹھ کر کہا قبلہ یہ مصرع بھی باندھیے۔

باندھی دم لنگور میں لنگور کی گردن

محفل میں ایک زور کا قہقہہ اڑا کیونکہ سید انشا اکثر دوپٹہ گلے میں ڈالے رہتے تھے اس طرح کہ اس کا ایک سرا آگے اور دوسرا پیچھے پڑا رہتا ہے چنانچہ سید انشا کے شاگردوں میں سے ایک صاحب اٹھے اور بلند آواز سے یہ شعر پڑھا۔

نعرہ پہ ظرافت کے ذرا تیغ کو دیکھو
سر لون کا منہ پیاز کا امچور کی گردن

شعر سنتے ہی خوب زور سے قہقہے اٹھے لوگ دیر تک ہنستے رہے۔ حضرت انشا اٹھے اور فرمایا۔ صاحبزادے ہماری موجودگی میں ہمارا خیال کیا ہوتا اگر یہی تعلیم لینی تھی تو مصحفی کے پاؤں پکڑے ہوتے۔ استاد کے تیور دیکھ کر نیک طبیعت شاگرد نے بھری محفل میں معافی چاہی۔ سید صاحب نے صاحبزادے کو گلے سے لگا لیا اور میر مشاعرہ کی اجازت حاصل کر کے مصحفی کے جواب میں ایک غزل پڑھی۔

غزل

توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

اچھلی ہوئی ورزش تیری ڈنڈ پہ مچھلی
ہے نام خدا جیسے سقنقور کی گردن

یوں پنجۂ مژگاں میں پڑا ہی یہ مرا دل
جوں چنگل شہباز میں عصفور کی گردن

یہ لفظ مشدد درست آیا ہے تجھ پر
خم ہوتی ہے کوئی مہری بلور کی گردن

تب عالم ہستی کا مزہ ہو کہ پڑی ہو
گردن پہ میری اس بت مخمور کی گردن

جب کشتۂ الفت کو اٹھایا تو الم سے
بس ہل گئی اس قاتل مغرور کی گردن

مضمون تو میرا ہی ہے گو اور طرح سے
باندھے تو گماں اپنے میں رنجور کی گردن

بھینچے ہی بغل اپنی میں اس زور سے جو عشق
تو توڑنے پر ہے کسی مجبور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشا
تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن

شعر پر شعر اور قافیہ پر قافیہ اور پوری غزل فی البدیہہ کہدینی آسان بات نہیں ہے۔ حضرت انشاؔ کی اس انشا پردازی نے لوگوں کے دلوں پر سکہ بٹھا دیا لیکن مقابلہ میں حضرت مصحفیؔ بھی کم نہیں۔ رہے میر مشاعرہ نے معاملہ کی نزاکت کا مطالعہ کرتے ہوئے موضوع کا بدلنا چاہا اور حضرت مصحفیؔ سے فرمایا " بھئی مصحفیؔ ہم نے سنا ہے کہ آپ سقنی کے حسن پر بھی شعر کہے جاتے ہیں اگر کسی نے غلط خبر نہ دی ہو تو ہمیں بھی سناؤ۔ حضرت مصحفیؔ مسکرائے اور کہا۔ تعمیل ارشاد کو فریضہ سمجھتا ہوں۔ منکر ہوں تو گنہگار ٹھیرا جاؤں۔ کل ایک سقنی نظر آئی دل کو بہت بھائی " دو میں تین شعر کہدئے اسے ظرافت سمجھیں یا واردات سے

پانی بھرے ہے یاروں قرمزی دوشالا	لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
کاندھے پہ مشک لیکر جب قد کو خم کرے ہے	کافر کا نشۂ حسن ہو جاتا ہے دوبالا
دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں	لنگی کے رنگ سے جب پانی ہو لالا

شعر کیا ہیں پسی ہوئی بجلیاں ہیں کہ جس پر گرتی ہیں جلا کر خاک کر دیتی ہیں ایک ایک شعر پر قہقہے اڑے لوگ خوب ہی ہنسے۔ لوٹ لوٹ گئے۔ میر مشاعرہ ہر شعر پر مسکراتے رہے۔ حضرت مصحفیؔ آداب بجالاتے اور اٹھنے لگے تو شمع مجلس نے فرمایا۔ بھئی اور شعر یاد ہوں تو سنادو پھر یہ صحبتیں کہاں۔ ارشاد عالیہ پر مصحفیؔ نے کہا۔ جوانی کے عالم میں ایک غزل کہی تھی حافظہ جواب دے گیا ہے حضرت دو شعر یاد ہیں عرض کئے دیتا ہوں۔

تہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو   مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا۔

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا   دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو قبلہ میر صاحب نے فرمایا۔ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا۔ ان کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر ہے چنانچہ مصحفی صاحب اسی قدر الفاظ کو فرمان آں تمغا اپنے کمال کا سمجھے بلکہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر سلام کئے۔ اور کہا کہ میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا۔ اس کے بعد میر مشاعرہ نے حاضرین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور تیسری نشست کے اعلان کے بعد محفل برخواست کی گئی۔

تیسری نشست

سیکریٹری بزم ادب نے اٹھ کر کہا آج کی نشست کے لیے بزم ادب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب کو عزت صدارت پیش کرتی ہے بزم ادب کو پوری توقع ہے کہ جناب مرزا صاحب اس درخواست کو قبول فرمائینگے حضرت ذوق، داغ اور مومن نے تائید فرمائی۔ محفل نے فلک بوس تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ جناب مرزا صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر کرسیِ صدارت پہ رونق افروز ہوئے۔ ایک بار پھر تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ سیکریٹری نے نہایت ادب سے شمع مجلس کے حضور میں شعرا کرام کی فہرست پیش کی جناب مرزا صاحب نے حاضرین کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا "۱۸۶۹ء سے آج تک طبیعت کلی کی طرح بند رہی۔ کسی گوشہ جنت میں سامان شگفتگی نظر نہ

آیا اللہ نے طبیعت میں شاعری ودیعت فرمادی۔ یہاں لاکر وہ ساری آزادی چھین لی اور اس پر قہر یہ کہ طبیعت نہ بدلی۔ کل میں ایک طرف کو نکل گیا۔ جہان فانی کی لذتیں اور عالم گذشتہ کی حسرتیں یاد آگئیں۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ زبان سے بے اختیار نکلا۔ ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

میرے یہ فلک شگاف نالے عرش معلیٰ تک پہنچ گئے۔ رب جلیل نے حضرت جبرئیلؑ کو بھیجا کہ دیکھو یہ کون اشکبار ہے۔ حضرت تشریف لائے۔ جنت کا گوشہ گوشہ دیکھ مارا کوئی بندہ سر بگریباں نظر نہ آیا لیکن آواز کا تسلسل قائم تھا۔ چنانچہ حضرت نے آواز کا تعاقب فرمایا اور اس جنت آشیاں کو پایا۔ اور پوچھا جنت کی لذتوں کو چھوڑ کر اس گوشے میں پڑے کیا کر رہے ہو! تمھارے نالوں سے تو عرش بریں میں بھی جنبش آگئی ہے۔ آدم کہیں بھی مطمئن نظر نہ آیا بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کی اللہ کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے مجھ جیسے گنہگار کو عالمِ اذیت سے اٹھا کر جنت جیسی پُرسکون دنیا میں جگہ عطا فرمائی مگر وہ اللہ ہے انسان نہیں ہے اور بڑی بات یہ کہ شاعر نہیں ہے۔ شاعر کے دل کو ٹٹول کر دیکھو چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ اس میں ایک آگ سی ہے جو دھیرے

دھیرے سلگ رہی ہے اسے جنت کی ٹھنڈک بھی سرد نہ کر سکی۔ اللہ نے کرم فرمایا سب سہولتیں عنایت فرمائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ؎

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

اس پر حضرت نے فرمایا۔ آدم اپنے اللہ کی نعمتوں پر کبھی شکر گذار نہ ہوا سوائے شکایت کے آدم نے کچھ اور سیکھا ہے!! اور پھر ہوس کا یہ عالم کہ طبیعت تو طبیعت نگاہ سیر نہیں ہوتی۔ میاں کس چیز کی کمی ہے جو رو رہے ہو دنیا میں تو تنگدستی کا رونا تھا اور یہاں کس چیز کا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ یا حضرت آپ کے سینے میں دل نہیں ہے۔ آدم کے سینے میں دل ہے۔ آپ دل کی کیفیتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ نے میرے متعلق یہی فیصلہ کیا کہ ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ سن کر حضرت نے فقیر کو غور سے دیکھا اور فرمایا تمھارے کلام میں گرمی سے زیادہ شستگی اور شیرینی بہت ہے بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کی یا حضرت جنت میں ایک بار مشاعرہ کی اجازت دلوا دیجئے کرم فرمائی ہوگی۔ حضرت کے لبِ لعلیں پر ہلکا سا تبسّم آیا اور فرمایا۔ تمھیں اب تک خبر نہیں ہوئی میاں پرسوں سے ان مسخروں نے ایک کہرام مچا رکھا ہے۔ دو نشستیں ہو بھی چکی ہیں اور دو باقی ہیں۔ میں روح افزا پیغام سن رہا تھا اور دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر حضرت کے قدم لیئے اور عرض کی ؎

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

حضرت جبرئیلؑ تشریف لے گئے میں خوش تھا کہ آرزو بر آئی اتنے میں بزم ادب کا پیغام پہنچا۔ میری مسرتوں کا عالم یہ تھا کہ وہیں بیٹھ گیا اور مشاعرہ کے لیئے غزل کہی۔ اس خطبے سے ساری محفل متاثر ہوئی اور تالیوں سے داد دی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے شعرا کی فہرست پڑھی اور فرمایا جو شعراء کرام اس نشست میں حصّہ لے رہے ہیں وہ اپنے جگر پاروں سے حاضرینِ محفل کو محظوظ فرمائیں گے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ شیخ امام بخش صاحب ناسخ لکھنوی۔

۲۔ خواجہ حیدر علی صاحب آتش لکھنوی

۳۔ شاہ نصیر الدین صاحب نصیر دہلوی

۴۔ جناب مومن خاں صاحب مومن دہلوی

۵۔ خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق دھلوی۔

اسمائے گرامی کی تکمیل پر حاضرین نے تالیوں سے ہر آنیوالے کا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے حضرت ناسخ تشریف لائے۔ شمع مجلس نے آپ کا تعارف فرمایا۔ آپ پہلوانِ سخن حضرت شیخ امام بخش صاحب ناسخ ہیں۔ آپ لکھنو طرز کے موجد اور لکھنو اسکول کے بانی ہیں۔ حضرت ناسخ کی مسلسل کوششوں سے سب سے پہلے بحیثیت لفظ کو اردو کا لقب ملا۔ آپ نے قدما کے فحش الفاظ اور محاورات سے اجتناب فرمایا۔ آپ نے تذکیر و تانیث

کے سخت قواعد مقرر فرماتے۔ غرض آپ کے حسنِ ذوق سے غزل کا دائرہ وسیع ہوا۔" تالیوں کا پھر شور بلند ہوا۔ شیخ صاحب نے کاغذ نکالا اور غزل پڑھی۔

غزل

دم بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جو لبوں سے نکل گیا

لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازہ پر
شعلہ سا ایک جیبِ کفن سے نکل گیا

ساقی بغیر شب جو پیا آبِ آتشیں
شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا

اب کی بہار میں یہ ہوا جوش اے جنوں
سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا

اس رشکِ گل کے آتے ہی بس آگئی خزاں
ہر گل بھی ساتھ بو کے چمن سے نکل گیا

اہلِ زمیں نے کیا ستم نو کیا کوئی
نالہ جو آسمانِ کہن سے نکل گیا

سنسان مثلِ وادیِ غربت ہے لکھنو
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

مناسب اشعار پر مناسب داد ملتی رہی اور یہی دستور شرافت ہے شمع محلس نے فرمایا۔ شیخ صاحب مشاعرہ کی تمہید نہایت عمدہ رہی کچھ شعر یاد ہوں تو فرمایئے۔ ایک گھونٹ سے کیا بجھتی ہے! شیخ صاحب نے شمع محفل کی حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کیا اور شعر عرض کیا۔

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

شعر کا پڑھنا تھا کہ واہ واہ کے نعرے بلند ہوتے پھر دوسرا شعر پڑھا۔

میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا
کہ زبانِ مژہ پر شکوہ ہے بینائی کا

واہ وا۔ کیا شعر ہے کیا خیال ہے کیا انداز ہے واللہ۔ خوب بہت خوب

پھر تیسرا شعر کہا ؎

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

مرزا صاحب نے فرمایا۔ شیخ صاحب نشتر چبھو رہے ہو۔ واہ کے لیے بہترین الفاظ تھے جو مرزا صاحب نے انتخاب فرمائے۔ شیخ صاحب نے اٹھ اٹھ کر سلام کیا اور چوتھا شعر پڑھا۔ ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

واہ وا کی بلند آوازوں سے کہرام مچ گیا۔ کئی بار شعر پڑھوایا گیا۔ پھر پانچواں شعر پڑھا ؎

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ پرواز تخیل کی انتہا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا شیخ صاحب! یہ مشاہدات ہیں۔ خوب کہتے ہیں۔ شیخ صاحب نے سلام کیا اور اپنی نشست پر تشریف لے گئے ان کے بعد حضرت آتش

تشریف لے گئے۔

شمع محفل نے آپ کا تعارف فرمایا۔ آپ خواجہ حیدر علی صاحب آتش ہیں۔ آپ کا کلام محاورہ اردو کا دستور العمل اور انشا پردازیِ ہند کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپ کو اگر تصوّف کی بنا پر اردو کا حافظ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ نے لکھنوی زبان اور عاشقانہ طرز کو سمو کر وہ رنگ ایجاد فرمایا ہے کہ حافظ شیرازی کی روح بھی وجد میں آگئی ہوگی۔ آپ کا کلام مہتاب کی طرح روشن ہے اشعار میں آتش بیانی کے علاوہ سوز و گداز بھی ہے۔ مثلاً ؎

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تیری محفل میں رہ گیا

بیٹھا تو عجز نقش کفِ پا لیے ہوئے ؎
اٹھا تو دردِ دل کا سہارا لیے ہوئے

اب آپ ان کا کلام انہیں کی زبانی سنیئے اور لطف اٹھائیے۔ حضرت آتش نے کاغذ نکالا اور کہا آپ نے ناسخ صاحب کی غزل ملاحظہ فرمائی اسی قافیہ میں غزل کہی ہے اور ابھی کہی ہے۔ عرض کرتا ہوں۔

غزل

بیمارِ عشق رنج و محن سے نکل گیا — بیچارہ منہ چھپا کے کفن سے نکل گیا
مرغانِ باغ آتش گل نے جلا دیے — صیاد ہاتھ مل کے چمن سے نکل گیا
دیکھا جو مجھ غریب کو بولے عدم کے لوگ — مدت سے تنہا یہ اپنے وطن سے نکل گیا

عالم جو ہے مطیع ہمارے کلام کا — کیا اسم اعظم اپنے دہن سے نکل گیا
آویزہ تیرے گوش کا ہو اس امید پر — کیا کیا عقیق کانِ یمن سے نکل گیا
زنجیر کا وہ غل نہیں زنداں میں اے جنوں — دیوانہ قید خانۂ تن سے نکل گیا
رتبہ کو تیرے سن کے ہک ہو کے ہر غزال — دیوانہ ہو کے دشتِ ختن سے نکل گیا

پھر طفل حیلہ جو کا بہانہ نہ مانیو
آتش وہ ابکی بار وطن سے نکل گیا

تماشائی دونوں حضرات کو چمکاتے رہتے ہیں۔ جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو ہنگامے بنانا انکا کام ہے۔

مشاعروں میں اکثر نوکا چوکی ہوتی رہتی ہے لیکن حق پوچھو تو ان فتنہ انگیزوں کا احسانمند ہونا چاہیئے۔ کیونکہ روشنیٔ طبع کو اشتعالک دیتے ہیں طرفین میں ایک صاحب نے ناسخ کو مخاطب فرما کر کہا۔ شیخ صاحب غزل ملاحظہ فرمائی آپ نے! شیخ صاحب نے اٹھ کر دو شعروں میں جواب دیا۔ ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب
بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب
جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

بھری محفل میں خوب قہقہے اُٹھے تالیوں کے شور سے فضا گونج اٹھی۔

خواجہ صاحب نے اپنے استاد حضرت مصحفی کی خدمت میں عرض کی یا حضرت ۲ شعر کہے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

امانت کی طرح زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

دراصل یہ شیخ صاحب پر چوٹ کی ہے حضرت مصحفی کو شیخ صاحب بہت عزیز ہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی باتیں انھیں پسند نہیں آئیں شعر سُن کر خاموش رہے۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ قبلہ اس ردیف قافیہ میں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجہ نکل پڑتا ہے۔ انھوں نے ہنس کر کہا۔ ہاں میاں سچ کہتے ہو اب تو کسی سے ایسے شعر نہیں ہوسکتے۔ اس کے بعد استاد نے انہی دو قافیوں کو ۲ شعروں میں باندھا اور ایک نو مشق لڑکے کو پڑھنے کے لیے فرمایا لڑکے نے محفل میں صاحب صدر کی اجازت سے ان اشعار کو پڑھا۔ ؎

لکھا ہے کوئے کو ہے یار سے اے دیدۂ گریاں
قیامت میں کروں گا گر کوئی حرف کفن بگڑا
نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشہ میں ٹھیک اترے
شبیہہ یار کھچوائی کمر بگڑی دہن بگڑا

ان اشعار پر محفل میں قیامت برپا ہوگئی سمجھنے والے سمجھ گئے کہ استاد کی استادی ہے۔ خواجہ صاحب اسی وقت اٹھے اور استاد کے پاس جا بیٹھے۔

اور غزل ہاتھ سے پھینک کر کہا کہ یہ آپ ہمارے کلیجہ میں چھریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منہ تھا جو ان قافیوں میں شعر نکالتا۔ استاد نے مسکرا کر فرمایا: میرے عزیز! ہر مقام پر آتش بیانی ٹھیک نہیں ہے۔ ہر شخص کے مرتبہ اور اپنی حد کا اندازہ رکھنا واجب ہے۔" استاد کا یہ فرمانا تھا کہ محفل میں ایک زور سے قہقہہ اڑا اور ناسخ صاحب نے بلند آواز سے کہا۔ استاد صاحب زندہ باد ان الفاظ نے حضرت آتش کے دل و دماغ میں چنگاریاں بھر دیں۔ فوراً کاغذ لیا اور قلم اٹھایا۔ پانچ منٹ میں ایک غزل کہہ دی۔ غزل کا ہر شعر ناسخ کی ذات کا ترجمان ہے۔

غزل

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

کیا کیا الجھتا ہے تیری زلفوں کے تار سے
بخیہ طلب ہے سینہ صد چاک شانہ کیا

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوق راحت منزل سے اسپ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشت خاک
بام بلند یار کا ہے آستانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو تیرا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد اسیر دام رگ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے میری قبض روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستاں ہی ہمارا فسانہ کیا

صیاد گلعذار دکھاتا ہے سیر باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا اُڑے گا نشانہ کیا

بیتاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ مے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے لکھی عاشقانہ کیا

حاضرین نے نہایت خاموشی سے غزل سُنی مقطع نے ناسخ اور استاد دونوں کا منہ بند کر دیا۔ لوگوں نے خوب داد دی۔ آتش کے دل کی بھڑاس نکل گئی۔ غزل واقعی قابلِ داد ہے۔ مرزا غالب نے فرمایا "خواجہ صاحب غزل کا ایک ایک شعر گوہر نایاب ہے اور تمام شعر جواہر پارے ہیں" جس غزل پر مرزا صاحب داد دیں تو پھر صاحب غزل کو فخر کیوں نہ ہو۔ حضرت آتش نے کئی بار سلام کیا۔ حضرت مصحفی چپ چاپ محفل سے اٹھ کر تشریف لے گئے۔ ان کے بعد حضرت ناسخ اور ان کے طرفدار بھی چلے گئے۔ آتش کے بعد حضرت نصیر تشریف لائے۔ چونکہ یہ بھی ناسخ صاحب کے طرفداروں میں سے ہیں۔ دل بھرا ہوا تھا آتے ہی کاغذ نکالا اور حضرت آتش سے کہا آتش صاحب غزل کہہ رہا ہوں توجہ فرمایئے۔

غزل

لو لگ رہی ہے جس سے وہ شمع رو نہ آیا — بل بے تیری شرارت یاں تک کبھو نہ آیا

ہوا وہ دہن سے رو کش سیلی صبا کی کھاتی — غنچہ کے آہ منہ سے کس دن لہو نہ آیا

دنداں دکھا کے مت ہنس اے بخیۂ گریباں — چاک جگر کا ہم کو طور رفو نہ آیا

کیا جانے یہ گیا تھا کس منہ سے روکشی کو — آئینہ داں سے لیکر خاک آبرو نہ آیا

برگشتہ بخت ہم وہ اس دور میں ہیں ساقی — لب تک کبھو ہمارے جام و سبو نہ آیا

موجِ سرشک سے ہے رونق قبائے تن کی — کیونکر کہوں کہ اس کو کارِ اتو نہ آیا

آخر کو کہکشاں ہے یکسر وہ مانگ نکلی — اس بات میں ہماری فرق اک ہو نہ آیا

کشتیِ دل تو دایم موجِ خطر میں ڈوبی — چیں بر جبیں ہو کس دن وہ روبرو نہ آیا

کیونکر یہ ہاتھ اپنا پہنچے گا تا گریباں — دست خیال جس کے دامن کو چھو نہ آیا

اپنی بھی بعد مجنوں یاں رو ہوا بندھی ہے — اے گردباد خیمہ کب کو بکو نہ آیا

نامحرموں سے تم نے کھلوائے بند محرم — میں تو بھی آہ لے کر کچھ آرزو نہ آیا

ہر دم نصیرؔ رہ تو امیدوارِ رحمت
تیری زباں پہ کس دن لاتقنطو نہ آیا

غزل کے خاتمہ پر تالیوں کا شور اٹھا۔ چاروں طرف سے داد ملی۔ حضرت آتشؔ نے کہا۔ میاں نصیرؔ! غزل خوب ہے مگر افسوس سننے والے اٹھ گئے۔ اس جملہ پر محفل میں پھر ایک قہقہہ اڑا۔

مرزا غالب شمع مجلس نے محفل کا رنگ بدلنے کے لیئے نصیر صاحب سے فرمایا۔ بھئی نصیر! فلک پہ بجلی زمیں پر باراں والی غزل تو سناؤ۔ لوگ کہتے ہیں کہ غزل خوب ہے ہمیں بھی سنا دو۔ نصیر صاحب کو غزل زبانی یاد تھی کہا۔ زہے قسمت جو مرزا صاحب نصیر کا کلام سننے کی آرزو فرمائیں۔ بہ تعمیلِ ارشاد عرض کرتا ہوں۔

غزل

سدا ہے اس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ شعلہ رو ہے سوار توسن اور اس کا عرق فشاں ہے
عجب ہے اک سیر دوپہر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

ہنسے ہے کوٹھے پہ یوسف اپنا میں زیر دیوار رو رہا ہوں
عزیزو دیکھو میری نظر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

اس شعر پر مرزا صاحب نے سر دھن کر داد دی اور دوبارہ کھلوایا۔

پتنگ کیونکر نہ ہووے حیراں کہ شمع سب کو دکھا رہی ہے
بچشمِ گریاں و تاجِ زر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

ہنسا کے افشاں چنو جبیں پر نچوڑ زلفوں کو بعد اسکے
دکھاؤ عاشق کو اس ہنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

اس شعر نے سب کو تڑپا دیا۔ شمع مجلس نے کئی بار کہلوایا۔

کہاں ہے جوں شعلہ شاخ پر گل کدھر ہے فصلِ بہار شبنم
بنا ہے اعجاز طرفہ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

گرد نہ دریا پہ مے کشی تم ادھر کو آؤ تو میں دکھاؤں
سرشک و ہر نالہ جگر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

کدھر کو جاؤں نکل کے یارب کہ گرم و سردِ زمانہ مجھ کو
دکھاتے ہے شام تک سحر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ تیغ کھینچے ہوئے ہے سر پر میں سر جھکائے ہوں اشک ریزاں
دکھاؤں اے دل تجھے کدھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

غضب ہے چیں بر جبیں وہ کیا ہے بن سی ٹپکے بھی ہے پسینہ
عیاں ہے یارو نئے ہنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نصیر لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سن کے جس کو
بند ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

حضرت آتش نے فرمایا۔ میاں نصیر! مقطع میں آپ دعوتِ سخن دے چلے ہیں لیکن اب قافیہ میں غزل کہنا بے حیائی ہے۔ غزل آپ کی ہمیں خوب پسند آئی ہے۔ نصیر صاحب سے شکریہ ادا کیا اور اپنی جگہ پر تشریف لے گئے۔ ان کے بعد حضرت مومن کو دعوتِ سخن دی گئی۔ حضرت تشریف لائے تو صدر محترم نے آپ کا تعارف فرمایا "آپ حضرت مومن خاں مومن دہلوی ہیں آپ کا کلام گذری ہوئی حکایات یا منظوم سرگذشت ہے۔ غزل ہیں نہ فلسفہ

حکمت کی ثقالت ہے نہ عرفان وتصوف کی پرواز۔ لیکن اسلوب بیان نے چار چاند لگا دئے ہیں۔ آپ نے اپنے انداز بیان میں عجیب ندرت اور نازک خیالی سے کام لیا ہے اور لطف یہ کہ ادائے مفہوم کے لئے نئے نئے اسلوب اختراع کئے ہیں۔ علاوہ ازیں شعر نہایت عمدہ ترنم کے ساتھ ایسی دردناک آواز سے پڑھتے ہیں کہ سننے والوں کے دل وجد کرتے ہیں۔ شمع محفل نے تعارف ختم فرمایا اور حاضرین نے تالیوں کے بلند شور سے حضرت مومن کا استقبال کیا اور ان تالیوں میں ترنم کی سفارش پنہاں تھی۔ حضرت مومن نے فرمایا "حضور شمع مجلس کی خدمت میں عرض گذارتا ہوں کہ بدبختی سے آج میری طبیعت درست نہیں ہے لیکن مرزا صاحب کے ارشاد گرامی کو عین فرض جانتا ہوں۔ فرض سے چشم پوشی کروں تو مومن کیونکر کہلاؤں! (اس جملہ پر خوب تالیاں بجائی گئیں)، چنانچہ اس وقت صرف ایک غزل پیش کرسکوں گا۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں" غزل ترنم سے شروع ہوئی۔

غزل

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

اس بت کے لیے میں ہوس حور سے گذرا
اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح
طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے
کم طالعی عاشق جانباز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو وزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکیِ دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسف بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومنؔ نہ ملا ہائے بتوں سے
جورِ اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

اوّل تو غزل کا ایک ایک شعر تڑپا نے والا ہے اور وہ بھی جناب مومنؔ کی زبان سے ادا ہوا اور ترنّم کے ساتھ۔ ان چیزوں نے مل جل کر کچھ ایسا اثر کیا کہ محفل کی محفل کھو گئی۔ غزل کے خاتمہ کے بعد دیر تک یہ اثر مسلط رہا حاضرین نے سرد آہوں کے ساتھ داد دی۔ حضرت مومنؔ نے شکریہ ادا کیا او شمع محفل کو سلام کیا اور اپنی جگہ پر تشریف لے گئے۔

انکے بعد حضرت شیخ ابراہیم ذوقؔ کی خدمت میں التماس فرمائی گئی وہ اپنی نشست سے جھک کر اٹھے۔ حاضرین نے پرخلوص تالیوں سے استقبال کیا۔ شیخ صاحب اسی طرح شمع محفل تک تشریف لے گئے اور دائیں جانب نہایت ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ حضرت غالب پیر و مرشد کی موجودگی میں میں شعر کہوں۔ یہ حاضرین کی زیادتی ہے جو مجھ سے ارشاد کیا گیا ہے" یہ سنکر مرزا صاحب نے مسکرا کر فرمایا "شیخ صاحب! جس جام ادب سے آپ نے شراب سخن پی ہے اسے کسی نے لبوں سے بھی نہیں

چھوا۔ کسرِ نفسی سے کام نہ لیجئے۔ ہم تو جواہر پاروں کو تبرک سمجھتے ہیں۔ یقین جانو انگور کا سا مزا آتا ہے کیوں نہ آئے کہ قلعہ معلی کی مقدس فضا نے پرورش کی ہے۔ شیخ صاحب نے جھک کر سلام کیا اور فرمایا۔ بہ تکمیل ارشاد عرض کرتا ہوں۔

غزل

لکھتے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورتِ تصویر نہالی
کیا اٹھے سرِ بسترِ غم اٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

جو دانہ رو تیدہ تہِ سنگ ہمارا
سر زیرِ گراں بارِ اَلم اٹھ نہیں سکتا

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر میرا ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

پردہ درِ کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گراں بار ہے جو رختِ سفر بھی
اے راہ روِ ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دست و کرم اٹھ نہیں سکتا

پوری غزل قابلِ داد ہے۔ حاضرین نے غور سے سنی اور تڑپ گئے۔ شمعِ محفل نے سر دھنا۔ بہت مناسب داد ملی۔ مرزا صاحب نے تیسرا اور

چوتھا شعر کئی بار کہوایا۔ شیخ صاحب نے کئی بار سلام کیا۔ پانچویں شعر پر مرزا صاحب کی زبان سے بے ساختہ واہ وا نکلا۔ محفل چمک اٹھی۔ شیخ صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا! شیخ صاحب سنا ہے آپ قصائد سے زیادہ مطلع بہت زور کا کہتے ہیں۔ کوئی یاد ہو تو فرمائیے۔ شیخ صاحب نے اسی شب ایک مطلع کہا تھا وہی سنا دیا۔

مطلع

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر

ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

کچھ لوگوں نے تعریف کی لیکن حضرت غالب خاموش رہے۔ شیخ صاحب نے کہا۔ قبلہ آپ نے سماعت فرمائی۔ مرزا صاحب نے کہا ہوں۔ وہیں شاہ نصیر تشریف فرما تھے مصرع کی غلطی اور مرزا صاحب کی خاموشی کو بھانپ گئے اور شیخ صاحب سے کہا۔ میاں ابراہیم پھول بٹوے میں نہیں ہوتے یہ کہو۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈالکر

شیخ صاحب کو یہ مصرع کھٹکا فوراً کہہ اٹھے۔ یہ کیلے ہے ! شاہ صاحب نے کہا سنکھیا ہے سنکھیا۔ دیکھو نزدیک بھی آؤ گے تو مر جاؤ گے۔ شیخ صاحب نے ہنس کر کہا۔ ع

بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہوئے تو میں جانوں

قبلہ عالم۔ پیر و مرشد۔ بندہ بے ادب نہیں ہے کہ گستاخ ہو جائے فقیر کا مدعا یہ ہے کہ دونے میں رکھنا ہوتا ہے۔ ڈالنا نہیں ہوتا۔ یوں فرمائیے

بادام یہ جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

شعر کی درستی اور باہمی چشمک پر محفل میں وہ غل مچا وہ شور اٹھا قہقہے اڑے کہ شمع مجلس اور سیکریٹری صاحب عاجز آگئے۔ لوگ خود ہی چپ ہوئے تو ہوئے۔ ان کے بعد حضرت داغ تشریف لائے۔ شمع مجلس نے تعارف فرمایا۔ آپ فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ ہیں کہ جن کی فصاحت اور سادگی نے اردو غزل کو گلزار بنا دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ اس محفل میں حضرت داغ بھی تشریف لائے اور اردو ادب کی ترقی کا باعث ہوئے (لوگوں نے تالیوں سے خیر مقدم کیا)

حضرت داغ نے کاغذ نکالا اور غزل پڑھی۔

غزل

بتوں نے ہوش سنبھالا جہاں شعور آیا
بڑے دماغ بڑے ناز سے غرور آیا

لٹے حیا ادھر آئی ادھر غرور آیا
میرے جنازے کے ہمراہ دور دور آیا

جہاں میں لاکھ حسیں ہوں تو انکو رشک نہیں
قیامت آگئی جس وقت نام حور آیا

عدو کو دیکھ کر آنکھوں میں اپنی خون اترا
وہ سمجھے بادۂ گلرنگ کا سرور آیا

قسم بھی وہ کبھی قرآں کی نہیں کھاتے
یہ رشک ہے انہیں کیوں آمین کر حور آیا

کہا جب اس نے تہ تیغ کون آتا ہے
پکار اٹھا دل مشتاق ناصبور آیا

لگا دیتیں ہیں تجلی کی حضرت موسٰی
کہ مہر بنکے جو آنکھوں میں کوہ طور آیا

الٰہی اشک مصیبت کی آبرو رکھنا — یہ بیکسی میں بڑے وقت پر ضرور آیا

شہیدِ ناز بھی عاشق مزاج بھی ہیں ہم
اسی لیے ملک الموت بنکے حور آیا

حاضرین نے غزل نہایت سنجیدگی سے سنی اور حضرت داغ کی بلند شخصیت کا احترام کرتے ہوئے مناسب داد دی۔ مرزا غالب نے فرمایا نواب صاحب مجھے آپ کا چوتھا شعر بہت پسند آیا ہے بتوں کی خو ہی ایسی ہے۔ میں نے بھی ایک شعر اسی مذاق کا کہا ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

داغ نے کہا، مرزا صاحب آپ کا خیال بہت بلند ہے۔ میری خاک اس شعر کو چھو بھی نہیں سکتی۔ محفل میں تالیوں کا شور اٹھا اور ختم ہو گیا۔ حاضرین نے حضرت داغ کی خدمت میں عرض کی کہ وہ کچھ اور ارشاد فرمائیں شمع محلس نے حاضرین کی تائید فرمائی۔ نواب صاحب نے دوسری غزل سنائی۔

غزل

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا — تمام رات قیامت کا انتظار کیا
ہنسا ہنسا کے شب وصل اشکار کیا — تسلیاں دے دے کے بیقرار کیا
یہ کس نے جلوہ ہمارے سر مزار کیا — کہ دل سے شور اٹھا ہائے بیقرار کیا

کہاں کا صبر کہ دم پر ہے بن گئی ظالم
جو تنگ آئے تو حالِ دل آشکار کیا
تڑپ پھر اے دلِ ناداں کہ غیر کہتے ہیں
اخیر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا
نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں
وہ بے قرار رہے جس نے بیقرار کیا
فسانہ شبِ غم اُن کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا کچھ نہ اعتبار کیا
کسی کے عشق نہاں میں یہ بدگمانی تھی
کہ ڈرتے ڈرتے خدا پر بھی آشکار کیا

بنے گا مہرِ قیامت بھی ایک خالِ سیاہ
جو چہرہ داغِ سیہ رو نے آشکار کیا

اس غزل پر خوب داد ملی مرزا غالب نے فرمایا۔ واہ وا۔ نواب صاحب! مقطع کی خوبیوں کو یا آپ جانتے ہیں یا اہلِ نظر۔ ستم ہے کہ کس خوبصورتی سے مہرِ قیامت کو بھی مات کیا ہے۔ حضرت داغ نے اٹھ کر سلام کیا اور اٹھے ہی تھے کہ حاضرین نے پھر شور مچایا کہ قبلہ اگر آپ اُٹھے تو محفل بھی اٹھ جائے گی۔ دیکھئے ۱۹۰۵ء کے بعد ۱۹۴۵ء میں آپ کی زیارت نصیب ہوئی ہے چالیس برس کے پیاسوں کو یہ چند قطرے؟ بخیلی نہیں تو اور کیا ہے؟ گستاخی معاف ہم نہ اٹھنے دیں گے آپ کو۔ چنانچہ نواب صاحب پھر وہیں بیٹھ گئے۔ اور مسکرا کر فرمایا۔ سمندر کی موجودگی میں پیاسے رہو تو قصور کس کا ہے (یہ اشارہ مرزا غالب کی ذات گرامی کی طرف تھا)، حاضرین نے کہا۔ ہائے دنیا وائے دنیا۔ ہزار جنتیں قربان اس چھوٹی سی اور مختصر سی دنیا پر جہاں بات کرنے کو تو زبان نہ ترستی تھی۔ نواب صاحب نے بھی افسوس کیا اور غزل سنائی

غزل

کس نے کہا کہ داغؔ وفادار مر گیا
وہ ہاتھ مل کے کہتے ہیں کیا یار مر گیا

دامِ بلائے عشق کی وہ کشمکش رہی
اک اک پھڑک پھڑک کے گرفتار مر گیا

آنکھیں کھلی ہیں پسِ مرگ اسلیئے
جانے کوئی کہ طالبِ دیدار مر گیا

جس سے کیا ہے آپ نے اقرار جی گیا
جس نے سنا ہے آپ سے انکار مر گیا

کس بے کسی سے داغؔ نے افسوس جان دی
پڑھ کر تیرے فراق کے اشعار مر گیا

ایک ایک شعر کئی کئی بار کہوایا گیا۔ شمع محلس نے کئی شعر تو خود اپنی زبان سے دہرائے اور وجد کیا۔ واہ وا کے نعرے بلند ہوئے۔ کئی حسّاس دل پگھل گئے۔ آنکھوں نے موتی نچھاور کیئے۔ جب نواب صاحب نے مقطع پڑھا تو خود ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ٹپکے بغیر نہ رہے۔ حضرت داغؔ کو پھر مجبور کیا گیا کہ وہ کچھ اور ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے اب نشترِ دل سے کام لیا۔ ؎

اللہ کو کیا جواب دوں گا
عادت ہے بتوں سے گفتگو کی

کچھ ضبط ہماری خاطر اے چشم
کچھ شرم ہماری آبرو کی

اِسی خانہ خراب دل میں اے داغؔ
مٹی ہے خراب آرزو کی

ایک ایک شعر پر قہقہے اڑے۔ جناب داغ نے ایک مطلع فرمایا۔

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

واہ وا۔ واہ وا۔ کیا مطلع ہے کیا نازک خیال ہے۔ شمع محفل نے بھی داد دی۔ نواب صاحب نے اٹھ کر سلام کیا اور اپنا ایک شعر پڑھا۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

مرزا غالب نے فرمایا نواب صاحب غرور حسن کی صحیح تصویر کھینچ دی آپ نے۔ اب اس کے بعد اس مضمون کو کون باندھے گا۔ میں بھی کوشش کروں تو بے حیائی ہے۔ نواب صاحب نے جھک کر سلام کیا۔ فضا تالیوں کے شور سے گونج اٹھی۔ پھر یہ شعر سنایا ؎

کچھ وہ حیرت سی کچھ وہ حسرت سی
خوب بنتی ہے انتظار سے آنکھ

مرزا صاحب کی زبان سے بے اختیار واہ وا نکلا۔ اور کہا۔ نواب صاحب آگ تو لگا دی ہے اب خاک کر کے اٹھو گے۔ نواب صاحب نے اٹھ کر سلام کیا اور تالیوں سے گونجتی ہوئی فضا سے گذرتے ہوئے اپنی نشست پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد محفل نے کہا۔ مرزا صاحب تبرک باقی ہے مرزا صاحب مسکرائے اور اپنا کلام سنانا شروع کیا ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

شعر سنتے ہی حاضرین کی زبان پر واہ واہ بہنایت خوب - خوب شعر ہے اور کئی بار کہوایا گیا ؎

قید و حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حاضرین کے علاوہ نواب داغ نے اٹھ کر کہا - مرزا صاحب موت و حیات کے فلسفہ کی گتھیاں سلجھا دی ہیں اور یہ آپ ہی کا حصہ ہے اور کہے تو بات نہ بنے - مرزا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر آداب کیا اور پھر یہ شعر سنایا -

ہزاروں خواہش ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حاضرین نے خوب داد دی - پھر دو شعر سنائے -

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے ‏ دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالہ بلبل کو بے اثر ‏ • پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

مرزا صاحب نے یہ شعر اس دردناک انداز سے پڑھے کہ سننے والے سر جھکا کر بیٹھ گئے - پھر یہ مطلع اور مقطع سنایا -

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے ‏ جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ ‏ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

یہ شعر سن کر سب تڑپ اٹھے - نواب داغ نے کہا - مرزا صاحب یہ مقطع واقعی ایک مغل بچہ ہی کہہ سکتا ہے - اس خودداری کی مثال نہ دیکھنے میں آئی نہ آئیگی - مرزا صاحب مسکرائے اور فرمایا - نواب صاحب آپ بھی کم نہیں

ہیں۔ اس جملہ پر محفل میں خوب قہقہے اڑے۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے ایک غزل سنائی۔ جس کا مطلع ہے۔

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے

غزل

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روشن و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

غزل کے مطلعے سب کے سب بیک زبان واہ کہہ کر تعجب میں ڈوب گئے

اور سہ بار مطلع کہوایا۔ یہی حال غزل کے شعر اول پر ہوا اور کئی بار کہوایا بعض اشعار پر تو اہلِ دماغ نے وہ داد دی کہ مرزا غالب کے لبوں پر ہلکا سا تبسم آئے بغیر نہ رہا۔ مشاعرہ میں ایک صاحب بیٹھے تھے بول اٹھے ہائے فیضی۔ کاش مشاعرہ میں وہ بھی ہوتے تو لطف آجاتا۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ دراصل لوگ فیضی کو جیسا سمجھتے ہیں ویسا ہے نہیں۔ اُس شخص نے جواباً کہا واہ۔ جب پہلی ہی بار اکبر کے دربار میں گئے تو انہوں نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ نہایت سرعت کے ساتھ پڑھ دیا اور وہ بھی فی البدیہہ۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ بھئی یہ بات کچھ فیضی ہی پر موقوف نہیں ہے۔ اب بھی اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر موقعہ پر کہہ سکتے ہیں۔ مرزا صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس شخص نے ایک چکنی ڈلی جیب سے نکالی اور کہا اس کے بارے میں کچھ شعر ارشاد فرمائیے۔ حاضرین کو ایک تماشہ ہاتھ آیا فوراً بول اٹھے ضرور۔ ضرور۔ مرزا صاحب نے قلم اٹھایا اور فوراً یہ قطعہ لکھ مارا۔

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیئے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیئے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیئے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیئے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیئے — سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیئے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجئے — خالِ مشکینِ رخِ دلکش لیلیٰ کہیئے
حجرُالاسودِ دیوارِ حرم کیجئے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیئے
وضع میں اسکو اگر سمجھئے قاف تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیئے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیئے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھئے — کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیئے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجئے — کیوں اسے مردُمکِ دیدۂ عنقا کہیئے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلےٰ لکھئے — کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیئے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض
اور اس چکنی سُپاری کو سویدا کہیئے

قطعہ کے ایک ایک شعر پر لوگ وجد کر رہے تھے قطعہ ختم ہوا تو وہ شخص آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر مرزا صاحب سے معافی چاہی مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا مجھے تمھارا ممنون ہونا چاہیئے جس نے میرے چراغِ سخن کو اور چمکنے کی قوت بخشی۔ انھیں چیزوں سے تو گرمئ سخن قائم ہے۔ محفل تالیوں کے شور سے گونج اٹھی۔ اس واقعہ سے مرزا صاحب کا وقار اور بھی بلند ہو گیا مرزا صاحب نے حاضرین مشاعرہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور بزم ادب کے بھی شکر گذار ہوئے کہ جس نے آپ کو یہ عزت بخشی۔ اس کیساتھ بزم ادب کا پیغام سُنایا کہ کل بزمِ ادب کی آخری نشست ہے اور اس میں تمام شعراء شرکت فرمائیں گے۔ اور مشاعرہ میں

فی البدیہہ غزلیں کہی جائیں گی۔ یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا اور کل کی نشست ایک یادگار نشست ہوگی، حاضرین نے تالیوں سے مجلسِ فردا کا خیر مقدم کیا۔ مجلس برخاست ہوئی اور دوسرے دن کی نشست کے لیے تیاریاں ابھی سے شروع ہوتیں۔

آخری نشست

دوسرے دن مشاعرہ کی آخری نشست کے لیے خاص اہتمام کیا گیا آج دل فریب رونق اور عجیب چہل پہل نظر آرہی ہے۔ جنت کے گوشے گوشے میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ حور و فرشتہ کی زبان پر شعر و شاعری کا تذکرہ ہے جنت سے لے کر اطراف تک اور اطراف سے لے کر جہنم کی ملتی ہوئی حدوں تک رنگا رنگ کے پھول لہلہاتے ہوئے مہک رہے ہیں۔ مشاعرہ کے گیٹ سے جنت کی طرف دور تک سبزہ کا فرش بچھایا گیا اور دونوں جانب مہکتے ہوئے پھولوں کے گملے ترتیب سے رکھے گئے۔

گیٹ بہت بلند بنایا گیا جس کا کونہ کونہ جواہرات کی لڑیوں سے سجایا گیا ہے۔ سچ پوچھو تو اس دروازے کو دیکھ کر در جنت شرما رہا ہے۔ خطۂ بہشت

کی نگاہوں اس سے پیشتر کبھی ایسا دلربا سماں اور روح افزا منظر نہیں دیکھا تھا۔ گیٹ کے دونوں جانب خدام ادب برف سے زیادہ سفید در شعاؤں سے زیادہ چمکیلا لباس زیب تن کئے کھڑے ہیں کہ آنے والوں پر گلاب چھڑک رہے ہیں۔ کمخاب واطلس کے فرش پر سنہری کرسیاں بچھائی گئیں شمال کی جانب فرش سے کچھ اونچی اسٹیج ہے۔ اسٹیج پر ایسی چمکدار چاندنی بچھی ہے کہ نگاہ نہیں ٹھیرتی۔ اس پر تین سنہری کرسیاں رکھی ہیں اور ان کے پیچھے چھ روپہلی کرسیاں بچھائی گئی ہیں۔ سٹیج کے بائیں طرف مرصع کرسیاں ایک سیدھی لائن میں ہیں۔ ان کے مقابل بارہ کرسیاں اور ہیں اور سیٹج کے سامنے جہاں کرسیوں کی لائن ختم ہوتی ہے۔ تین ادھر اور تین ادھر کرسیاں لگائی گئی ہیں درمیان میں ایک کشادہ راستہ چھوڑا گیا ہے۔ جہاں سے آمد ورفت ہوگی۔ کرسیوں کے حلقہ کے اندر فرش پر سامعین کے لیے فرش بچھایا گیا ہے۔ اے لو لوگ آنے شروع ہو گئے۔ ہر ایک کی نگاہیں سج دھج کو اٹھ اٹھ کر دیکھ رہی ہیں۔ لبوں پر تبسم ہے اور تبسم کے لب پر داہ ہے۔ لوگ جوق در جوق آرہے ہیں۔ ارے یہ تو آدمی تین آگے اور چھ پیچھے ہیں ہیں۔ ذرا نزدیک آئیں تو پہچان کرتا تا ہوں۔ آہا۔ درمیان میں حضرت امیر خسرو دائیں طرف سلطان غیاث الدین اور بائیں جانب حضرت مرزا غالب ہیں۔ اور ان کے پیچھے۔ یہ بزرگ لوگ ...... ذرا اور نزدیک آئیں تو پہچان میں آئیں ارے وہ تو حضرت سعدی ہیں اور وہ حضرت نیر ازی ہیں۔ وہ حضرت نظامی ہیں اور وہ ظہیر صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ جناب

انوری اور وہ کالیداس صاحب ہیں۔ یہ سب لوگ سٹیج پر تشریف لائے پہلی صف کی تین کرسیوں پر درمیان میں حضرت سلطان غیاث الدین بلبن تشریف فرما ہوئے۔ ان کے دائیں طرف حضرت امیر خسرؔو اور بائیں طرف حضرت مرزا غالب جلوہ افروز ہوئے پیچھے کی صف میں وہ لوگ رونق افروز ہوئے جن کے اسمائے گرامی ابھی گنا چکا ہوں۔ جو صف کرسیوں کی سٹیج سے دائیں جانب سے شروع ہوتی ہے۔ ان کرسیوں پر حضرت ولی دکنی شاہ مبارک ابرو۔ شیخ شرف الدین مضمون۔ محمد شاکر ناجی۔ محمد احسن احسن۔ غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ سراج الدین علی خاں آرزو اور اشرف علی خاں فغاں جلوہ افروز ہیں۔ ان کے علاوہ آخری تین کرسیوں پر محمد شاہ بادشاہ۔ نواب شجاع الدولہ اور سعد اللہ گلشن جلوہ افروز ہیں۔

کرسیوں کی بائیں صف پر۔ مرزا جان جاناں مظہر۔ میر عبد الحی تاباں۔ مرزا محمد رفیع سودا۔ خواجہ میر درد۔ سید محمد میر سوز۔ میر محمد تقی میر۔ شیخ قلندر بخش جرات۔ میر غلام حسن حسن۔ سید انشا اللہ خاں انشا۔ اور شیخ غلام ہمدانی۔ مصحفی تشریف فرما ہیں۔ ان کے علاوہ آخری دو کرسیوں پر شاہ عالم بادشاہ اور نواب آصف الدولہ رونق افروز ہیں۔

سامنے والی کرسیوں پر شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ شاہ نصیر الدین نصیر مومن خاں مومن۔ شیخ ابراہیم ذوق اور نواب داغ جلوہ افروز ہیں۔ سیکریٹری بزم ادب نے سٹیج پر آنکر کہا ہمیں افسوس ہے ہم پہلی نشستوں میں حضرت امیر خسرو طوطی ہند تشریف نہ لاسکے۔ مگر آج ہماری خوشی کی انتہا نہیں ہے

کہ حضرت امیر خسرو صاحب نے بزم ادب کی درخواست قبول فرما کر بزم کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ حاضرین نے تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ سیکرٹری صاحب نے شعراء کرام کی فہرست شمع محفل حضرت امیر خسرو کی خدمت میں پیش کی حضرت امیر خسرو نے اٹھ کر فرمایا۔ میں بزم ادب کی طرف سے یہ عزت اپنے کرم فرما حضور سلطان غیاث الدین بلبن کی خدمت اقدس میں پیش کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے سلطان مذکور کے سامنے فہرست شعراکرام رکھ دی حاضرین نے پھر تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ چنانچہ اس نشست کی صدارت سلطان غیاث الدین بلبن کو بخشی گئی۔ آپ نے حسنِ اخلاق کے ساتھ اس خدمت کو قبول فرمایا۔ اور فہرست پڑھ کر تمام شعراکرام کے نام سنا دیے۔ اس کے بعد باقاعدہ مشاعرہ شروع ہوا۔ حضرت امیر خسرو نے فرمایا کہ آج کی نشست دعوت عام ہے۔ ہر ایک صاحب کو فی البدیہہ کلام کہنا ہوگا۔ ایک صاحب کے بعد جو غزل پر غزل کہنا چاہیں آزادانہ شمع مجلس کی اجازت حاصل کر کے کلام سنا سکتے ہیں اب باقاعدہ کارروائی عمل میں آتی ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن نے اٹھ کر فرمایا "جو کچھ حضرت امیر خسرو صاحب نے ارشاد فرمایا ہے۔ عین درست ہے لیکن میری رائے ہیں اس نشست کو اس قدر مقید اور پابند نہیں کرنا چاہیئے بلکہ میرا خیال ہے کہ جو صاحب غزل لکھ کر لائے ہیں انھیں بھی آزادی دی جائے کہ اپنا کلام سنائیں۔ اس طرح سے اگر کسی کے پاس کسی دوسرے کی غزل پر غزل پہلے سے لکھی ہوئی

ہو تو وہ بھی اپنی غزل سنا سکتے ہیں امید ہے آپ حضرات بھی اس رائے سے اتفاق فرمائیں گے۔" حاضرین نے تالیوں سے تائید فرمائی اور اسی فیصلہ پر مشاعرہ کی ابتدا ہوئی۔ سب سے پہلے حضرت آتش نے اپنی آتش بیانی سے کام لیا اور غزل سنائی۔

غزل

وصفِ چشمِ یار میں یارا نہیں تقریر کا
جائے خاموشی ہے عالم سرمہ کی تحریر کا

کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل میں داغ ہیں
اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا

خود بیاں رخ کی صباحت کا اے شیریں دہن
فتنہ کے کوزے سے جاری ہو وے دریا شیر کا

کس خوشی سے دوڑ کر عاشق کٹاتے ہیں گلے
نقش جب اک ترک جوہر ہے تیری شمشیر کا

رتبۂ موسیٰ نمازِ پنجگانہ نے دیا
پانچ وقت اللہ سے موقعہ رہا تقریر کا

جو کہ لکھا خوب لکھا دست رس ہوتا اگر
چومتا میں ہاتھ اپنے کاتبِ تقدیر کا

اس پری رو طفل کا دیوانہ ہوں آتش جسے
کھیل ہے اک توڑنا سودائی کی زنجیر کا

غزل نہایت عمدہ رہی ایک ایک شعر پر داد ملی۔ صاحبِ صدر نے بھی غزل پسند فرمائی۔ حضرت غالب غزل سن رہے تھے اور کاغذ پر اسی بحر میں غزل لکھتے جا رہے تھے۔ حضرت آتش کے بعد حضرت میر تقی میر اٹھے اور شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی۔ شمع مجلس نے مسکراتے ہوئے اجازت

شی حاضرین نے میر صاحب کا تالیوں سے خیر مقدم فرمایا۔ حضرت میرؔ نے
زل پڑھی۔

غزل

میر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہے پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغ جہاں اِلّا یہ حیران دخفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

بوئے خوں سے جی رکا جاتا ہے اے بادِ بہار
ہو گیا ہے چاک دل شاید کسو دلگیر کا

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا

ده گذر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اِس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

بس طبیب اٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردِ سر
کامِ جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا

نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم
قد خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

جو ترے کوچے میں آیا پھر وہیں گاڑا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاکِ دامنگیر کا

خون سے میرے ہوئی یکدم خوشی تم کو تو ایک
مفت میں جاتا رہا جی ایک بے تقصیر کا

لختِ دل سے جوں چھڑی پھولوں کی گوندھی ہیں لے
فائدہ کچھ اے جگر اس آہِ بے تاثیر کا

گورِ مجنوں سے نہ جاوینگے کہیں ہم بے نوا
عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

یہ غزل حضرتِ آتشؔ کی غزل پر بھاری رہی خوب داد ملی اور بعض اشعار تو

مرتبہ کہوائے گئے ۔ حضرت غالب نے جناب میر کی غزل کو بڑے غور سے سُنا اور پھر اپنی غزل پر نظرِ ثانی کی ۔ دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں حضرت غالب اپنی غزل کی تصحیح چاہتے ہیں ۔ میر صاحب کے بعد حضرت امیر مینائی اُٹھے اور سٹیج کی طرف تشریف لے گئے ۔ شمع مجلس اور دوسرے اصحاب نے اٹھ کر نہایت ادب سے آپ کا استقبال فرمایا ۔ حاضرین نے تالیوں سے آپ کا خیر مقدم فرمایا ۔ آپ نے سٹیج پر کھڑے ہو کر غزل پڑھی ۔

غزل

کوئی دم پیکاں نہ ٹھہرا دل میں تیرے تیر کا
رہ گیا کیا خاک پھڑک کر دم تیرے نخچیر کا

مجھ سے وحشی کا کھنچے ہاں سے نقشہ دل کیا
رنگ صفحے پر نہیں جمتا میری تصویر کا

آئینے سکتے میں آجاتا ہے مجھ کو دیکھ کر
منہ تکا کرتی ہے حیرانی میری تصویر کا

ہوں وہ مشتاقِ شہادت دیکھ کر میری تڑپ
صورتِ بسمل پھڑک جاتا ہے دم شمشیر کا

اہلِ دولت سے سوا ہے صاحبِ جرات کی قدر
سیم و زر سے تیز ہے نرخ آہن و شمشیر کا

سینہ مجروحِ مژہ ہے دل ہے ابروے و دونیم
وار مجھ پر تیر سے بڑھ کر پڑا شمشیر کا

توڑ کر سینے کو کاٹا ہے تیری مژگاں نے دل
توڑ اس میں تیر کا ہے کاٹ ہے شمشیر کا

کچھ دم آخر نہ اٹھا سخت جانی کا مزہ
پاس مجھ کو آگیا قاتل تیری شمشیر کا

یاد دلواتی ہے کیا کیا ہائے بجلی کی تڑپ
بے تکلف وہ اُگل پڑنا تیری شمشیر کا

تھا کسی کی ابروئے خمدار کا یہ انتظار
دیدۂ جوہر میں اٹکا آکے دم شمشیر کا

گرم بازار تجلی تیری باتوں سے ہوا
لو ہے شمع طور کی شعلہ تیری تقریر کا

ہوں وہ مجنوں جھاڑتا ہوں ٹھیکے میں کاکلِ صبح
رستہ جاروب مشرق سے کوچۂ زنجیر کا

دشت وحشت میں چبھے ہیں خار ایسے پر قدم
پاؤں شانہ بن گیا ہے گیسوئے زنجیر کا

پھونکتی ہے مجھ کو اس گیسوئے افشاں کی چمک
دل ہے پروانہ چراغِ خانۂ زنجیر کا

حلقۂ گیسو میں پائی نقدِ دل دیکر جگہ
دیدیا پہلے کرایہ خانۂ زنجیر کا

طوق مجنوں کی گرانی کیا اٹھا ہوں پر چڑھے
ایک حلقہ ہے میری اتری ہوئی زنجیر کا

رنگ دیا جوشِ وحشت عشقِ چشمِ یار میں
نرگسِ شہلا ہے ہر حلقہ میری زنجیر کا

مرگیا دیوانہ کاکل تو حسرت نے کہا
آج کیا ویراں نظر آتا ہے گھر زنجیر کا

جب تھکا گردوں سے مرد دل نے اٹھایا بارِ عشق
بوجھ سر پر رکھ لیا اس نوجواں نے پیر کا

کس پری کی زلف سے تشبیہ اسکو ہے امیر
سلسلہ پہنچا کہاں جاکر میری زنجیر کا

امیر مینائی

یہ غزل سب پر حاوی رہی اکثر اشعار بار بار کہلوائے گئے۔ حاضرین سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ زبان اور کلام کے مزے لیتے تھے اور داد دیتے تھے۔ آپ کی غزل کے بعد حضرت غالب نے کاغذ کو تہ کرکے جیب میں ڈال لیا۔ حاضرین جلسہ تاڑ گئے اور اصرار فرمایا کہ جب تک حضور مرزا صاحب اس غزل پر غزل نہ سنائیں گے ہم نہ مانیں گے۔ حضرت امیر خسرو نے بھی حاضرین کی تائید فرمائی چنانچہ مرزا صاحب غزل سنانے پر مجبور ہوگئے اور غزل پڑھی۔

غزل

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

مرزا صاحب نے مطلع فرمایا تو حضرت امیر مینائی نے اٹھ کر فرمایا۔ اگر مرزا صاحب مجھ سے پہلے غزل سنا دیتے تو میں اس بیہودہ گوئی سے باز رہتا۔ حضرت آتش نے فرمایا کہ اگر مجھے علم ہوتا تو میں کبھی یہ جرأت نہ کرتا۔ لیکن حضرت میر تقی میر نے فرمایا کہ بھئی غزل سب کی عمدہ رہی ہے لیکن مطلع مرزا صاحب کا ہی چمکتا ہے۔ محبوب کے خط کی تفسیر جس انداز میں مرزا صاحب نے فرمائی ہے ہمارے احاطۂ تخیل سے باہر ہے۔ ہم مرزا صاحب کو داد دیتے ہیں کہ آپ نے دربارِ غالب میں محبوب کی شوخیٔ تحریر کی شکایت کے لیے ایسے مظلوم پیش فرمائے ہیں جنھیں دیکھتے ہی سراپا شکایت کا شبہ گزرتا ہے۔ میر صاحب کی فصاحت نے مرزا صاحب کی غزل کو ایسا چمکایا کہ محفل میں وہ قہقہے اٹھے وہ شور اٹھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دی۔

میر مشاعرہ نے بمشکل حاضرین کو خاموش کیا۔ خاموش ہونے پر بھی واہ مرزا صاحب واہ کی ہلکی ہلکی آوازیں نہ دب سکیں۔

اِس کے بعد حضرت داغ نے ایک غزل سنائی۔

مرزا صاحب سر دھنتے تھے اور بعض اشعار اپنی زبان سے دہراتے تھے۔

غزل

مزا ہر ایک کو تازہ ملا ہی عشق جاناں کا
نگاہ کو دید کا لب کا فغاں کا دل کو ارماں کا

نہیں معلوم کہ مدت سے قاصد حال کچھ ان کا
مزاج اچھا تو ہے یا دشمن بخیر اس آفت جاں کا

یہ کیا ہی آج غیروں سے میری تعریف ہوتی ہی
یہ کیا ہی خود بیاں ہوتا ہی اپنے جور پنہاں کا

فلک پردہ بنا اہل ترمیں کی پردہ پوشی کو
مگر اس دشمن جاں نے کسی کا عیب لب ڈھاں کا

بنا کر اپنا دیوانہ الگ سے بچ کر چلے جانا
تیرے دامن سے لینا ہی ہمیں بدلہ گریباں کا

کسی کی شرم آلودہ نگاہوں میں یہ شوخی ہی
اسے دیکھا اُسے دیکھا ادھر تاکا اُدھر جھانکا

تیری آتش بیانی داغ روشن ہی زمانے پر
پگھل جاتا ہی مثل شمع دل ہر اک سخن داں کا

غزل نہایت شستہ زبان میں فرمائی گئی ہے۔ حاضرین نے بہت خوب داد دی۔ یہاں تک کہ حضرت سلطان غیاث الدین نے اٹھ کر فرمایا کاش ایسے شعر میں بھی کہہ سکتا۔ یہ جملہ ہزار تعریفوں کا حامل تھا۔ حضرت داغ نے اٹھ کر بار بار سلام کیا۔ آپ کے بعد حضرت آتش نے شمع مجلس سے اجازت

طلب فرمائی۔ حاضرین نے تالیوں سے خیر مقدم فرمایا۔ حضرت آتش نے فی البدیہہ یہ غزل کہی۔

غزل

غدا سر دے تو سودا دے تیری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں دے تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

جگر خوں پان کھا کر کر چکے لعلِ بدخشاں کا
ملو مہندی جو پھیرا چاہتے ہو پنجۂ مرجاں کا

دلِ صد پارہ کو سودا ہی اک گیسوئے پیچاں کا
نگہباں افعی مسکین ہے اس گنجِ شہیداں کا

دل اس کا ہے خیالِ یار اگر تشریف فرما ہو
قدم آنکھوں کے اوپر سر کے اوپر ایسے مہماں کا

خیال تن پرستی چھوڑ فکرِ حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

شبِ مہتاب میں منہ کھول کر وہ شوخ سوتا ہے
ستارہ آج کل چمکا ہوا ہے ماہِ تاباں کا

جمالِ یار نے جو نقش اپنا اس میں بٹھلایا
دلِ مشتاق پر عالم ہوا یوسف کے زنداں کا

جبیں پر اپنے افشاں کو جو اس محبوب نے چھڑکا
کتابی چہرہ نے نقشہ دکھایا لوحِ قرآں کا

پھرے رہتے ہیں مشتاقوں سے اپنے آجکل یعنی
ان آنکھوں پر بھی سایہ پڑ گیا برگشتہ مژگاں کا

ملال آیا ادھر اسکو فنا تھا دم ادھر اپنا
بلا سے جاں خفا ہونا ہے خوش اسلوب انساں کا

رخِ روشن تیرا جو دیکھتا ہے وہ یہ کہتا ہے
سحر کو کوئی منہ دیکھے تو ایسے مہرِ تاباں کا

اسی سے عاشق اس محبوب کی فریاد کرتے ہیں
شکوہِ حسنِ عالمگیر سے ہے رتبہ سلطاں کا

چمک جانے سے اسکے بند جو ہو جاتی ہیں آنکھیں
یہ دھوکا برق دیتی ہے تمھارے روئے خنداں کا

وہ بوسہ یار دیتا تھا جو دن کو رات پر ٹالا
لیا تھا صبح میں نے نام کس کنجوس انساں کا

بہار آئی ہے سائل ساغرِ مے کا ہو ساقی سے
چمن سرسبز ہیں آتش کرم ہے ابرِ باراں کا

حضرت آتش نے یہ طول طویل غزل نہایت خوبی سے ادا فرمائی۔ کبھی کبھی رک جاتے معلوم ہوتا کہ مضمون بندی ہو رہی ہے اور فکرِ بندش زوروں پر ہے۔ آپ کے رکنے سے سب لوگ خاموشی سے آپ کا منہ تکتے۔ پھر شعر پر قہقہے اُڑتے اور داد ملتی۔ بعض شعروں پر حضرت غالب نے داد دی اور حضرت آتش نے کئی بار سلام کیا۔ ان کے بعد حضرت امیر مینائی نے شمع محفل کی اجازت سے یہ غزل پڑھی اور مجلس میں کہرام مچ گیا۔ لوگ بیخودی کے عالم میں اٹھتے اور بیٹھتے سر دھنتے اور داد دیتے۔

غزل

پوچھا نہ جائیگا جو وطن سے نکل گیا
بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

کانٹوں نے بھی نہ دامنِ گلچیں پکڑ لیا
بلبل کو ذبح کر کے چمن سے نکل گیا

منظورِ عشق کو جو ہوا اوجِ حسن پر
قمری کا نالا سروِ چمن سے نکل گیا

مدِ نظر رہی ہیں الہی رضائے دوست
گالی زباں جو شکوہ دہن سے نکل گیا

طاؤس نے دکھائے جو اپنے بدن کے داغ
روتا ہوا سحاب چمن سے نکل گیا

میں شعر پڑھ کے بزم سے کیا اٹھ گیا امیر
بلبل چہک کے صحنِ چمن سے نکل گیا

آپ کے بعد حضرت مومن نے اسی زمین میں غزل پڑھی

غزل

آگ اشکِ گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا
آنسو جو اس نے پونچھے شب اور ہاتھ جل گیا

پھوڑا دل نہ پر خلل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

کیا روؤں خیرہ چشمیٔ بخت سیاہ کا
واں شغل سرمہ ہے ابھی یاں نیل ڈھل گیا

کی مجھ کو ہاتھ ملنے کی تعلیم ورنہ کیوں
غیروں کو آ کے بزم میں وہ عطر مل گیا

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کچھ جی گرا پڑے تھا پر اب تو نے ناز سے
مجھ کو گرا دیا تو مرا جی سنبھل گیا

ملبحات ہے گریہ خاک میں اس نے وہاں کی خاک
گل کی تھی کیوں کہ پاؤں وہ نازک پھسل گیا

بتخانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

مومن کی خوش الحانی کے اثر نے ایک جادو کا اثر کیا۔ دوسرے تخیّل کے نشتروں سے دل چھلنی کئے اور اس پر حسن کے جلووں نے آنکھوں کو خیرہ کیا۔ ان کے بعد حضرت داغ نے اسی زمین میں غزل پڑھی۔

غزل

نالہ ہر اک بشر کے جگر سے نکل گیا
جی ہی بہنس گیا وہ جدھر سے نکل گیا

اللہ رے اس کا حسن ترقی بلا کی ہے
ہر موئے زلف موئے کمر سے نکل گیا

جس دل پہ وہ نگاہ پڑی دل کے پار تھی
یہ نیچہ ہزار سپر سے نکل گیا

اللہ رے جوش گریہ کہ اس جذب و ضبط پر
دریا ہمارے دیدۂ تر سے نکل گیا

وہ داغ بے وفا تو نہ ہو آج دھوم ہے
کوئی غلام آپ کے گھر سے نکل گیا

شراب پنج آتشہ نے دلوں کو مسرور کیا غزل کا مطلع شمع مجلس نے پسند فرمایا اور مرزا صاحب نے بار بار کہلوایا۔ ان کے بعد حضرت آتش نے شمع مجلس کی اجازت سے اسی زمین میں غزل پڑھی۔ آتش کی آتش بیانی ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

بیمارِ عشق رنج و محن سے نکل گیا
بیچارہ منہ چھپا کے کفن سے نکل گیا

مرغانِ باغ آتشِ گل نے جلا دئے
صیاد ہاتھ مل کے چمن سے نکل گیا

دیکھا جو مجھ غریب کو بولے عدم کے لوگ
مدت سے تھا یہ اپنے وطن سے نکل گیا

عالم جو تھا مطیع ہمارے کلام کا
گیا اسم اعظم اپنے دہن سے نکل گیا

جوشِ جنوں نے فصد سے مطلق کمی نہ کی
سیر دل لہو ہمارے بدن سے نکل گیا

آویزہ تیرے گوش کا ہو اس امید پر
کیا کیا عقیق کان یمن سے نکل گیا

زنجیر کا وہ غل نہیں زنداں میں اے جنوں
دیوانہ قید خانۂ تن سے نکل گیا

رتبہ کو تیرے سن کے سبک ہو کے ہر غزال
دیوانہ ہو کے دشتِ ختن سے نکل گیا

پھر طفلِ حیلہ جو کا بہانہ نہ مانیو
آتش وہ ایک بار تو فن سے نکل گیا

جب حضرت آتش نے مطلع پڑھا اور منہ پر آستین رکھ کر مطلع کا مصرعِ ثانی پڑھا تو سب نے دلوں پر ہاتھ رکھ لیئے۔ اسی طرح باقی شعروں پر حاضرین تڑپتے رہے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے۔ مرزا غالب نے مطلع کئی بار کہلوایا اور مزے لے لے کے سنا۔ شمع محلس نے اعلان فرمایا کہ اگر کوئی صاحب اس زمین میں غزل سنانا چاہتے ہوں تو تشریف لائیے لیکن کوئی نہ اٹھا چنانچہ حضرت آتش نے شمع محلس کی اجازت سے ایک دوسری غزل پڑھی

غزل

رات کو مینے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیداد نے سونے نہ دیا

خاک پر سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

شام سے وصل کی شب آنکھ نہ جھپکی تا صبح
شادیِ دولتِ دیدار نے سونے نہ دیا

ایک شب بلبلِ بیتاب کے جاگے نہ نصیب
پہلوئے گل میں کبھی خار نے سونے نہ دیا

جب لگی آنکھ کراہا یہ بدخواب ہے کیا
نیند بھر کر دلِ بیمار نے سونے نہ دیا

درد سر شام سے اس زلف کے سودے میں رہا
صبح تک مجھ کو شبِ یار نے سونے نہ دیا

رات بھر کی دلِ بیتاب نے مجھ سے باتیں
رنج و محنت کے گرفتار نے سونے نہ دیا

سیل گریہ سے مرے نیند اڑی مردم کی
فکر بام و در و دیوار نے سونے نہ دیا

باغِ عالم میں رہیں خواب کی مشتاق آنکھیں
گرمیٔ آتشِ گلزار نے سونے نہ دیا

سچ ہے غمخواریِ بیمار عذابِ جاں ہے
تا دمِ مرگ دلِ زار نے سونے نہ دیا

تکیہ تک پہلو میں اس گل نے نہ رکھا آتش
غیر کو ساتھ کبھی یار نے سونے نہ دیا

غزل کا مطلع سب کو بہت پسند آیا اور کئی بار کہوایا اسی طرح کئی شعر دو بار کہوائے گئے حضرت آتش نے غزل ختم فرمائی تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ میر مشاعرہ نے بغور ہر ایک کے چہرہ کا جائزہ دیا آخر حضرت ظفر اٹھے فوراً ہی حضرت ذوق اٹھے۔ جھک کر آداب بجالاتے اور نہایت ادب سے آپ کو شمع تک پہنچایا گیا۔ حضرت غالب نے اٹھ کر استقبال کیا حضرت ظفر نے فی البدیہہ آتش کی غزل پر غزل کہی۔ لوگ دنگ رہ گئے غزل کے ایک ایک شعر پر داد دی۔ اور حضرت مومن سے مخاطب ہو کر فرمایا بھئی آتش توجہ سے سنیئے اور مطلع پر غور فرمائیے۔

غزل

رات بھر مجھ کو غمِ یار نے سونے نہ دیا
صبح کو خوفِ شبِ تار نے سونے نہ دیا

شمع کی طرح مجھے رات کٹی سولی پر | چین سے یادِ قدِ یار نے سونے نہ دیا
یوں کراہا ترا بیمارِ الم درد کے ساتھ | کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا
اے دلِ زار تو سویا کیا آرام سے رات | مجھے پل بھر بھی دلِ زار نے سونے نہ دیا
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو | میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا
سو دوں میں کیا کہ میرے پاؤں کو کبھی نہ اکثر | آرزو سے خلشِ خار نے سونے نہ دیا

یاس و غم و رنج و الم میرے ہوئے دشمن جاں
اے ظفر شب کو ان چاروں نے سونے نہ دیا

حضرت مومن نے غزل کے شعر پر اعتراض فرمایا اور کہا کہ "شمع کی طرح مجھے رات کٹی سولی پر" مجھے رات کٹی کی بجائے میری رات کٹی ہوتا تو شعر شعر ہو جاتا۔ اسی طرح جب دلِ زار آرام سے سو رہا ہو تو پھر دوسرے کو بیتاب کرنے کے لیے دلِ زار کیا کوشش کرے گا؟ کیا ہی اچھا ہوتا جو غزل استاد صاحب کو دکھا دی ہوتی۔ اتنا کہنا تھا کہ محفل میں وہ قہقہہ اڑا کہ حاضرین کو خاموش کرنا مشکل ہو گیا۔ حضرت ظفر نے سقم کو دل ہی دل میں تسلیم کیا اور کچھ نادم سے ہوئے۔ انکا بھری محفل میں نادم ہونا حضرت ذوق کے لیے قیامت تھا لیکن ذوق نے عقل مندی کی کہ معاملہ کو وہیں چھوڑ دیا۔

ان کے بعد حضرت داغ نے ایک غزل پڑھی جس نے مشاعرہ کو تڑپا دیا۔

غزل

توہی اپنے ہاتھ سے جب دلربا جاتا رہا
دل کی کچھ پروا نہیں جاتا رہا جاتا رہا

جب توقع پر تھی اپنی زندگی وہ مٹ گئی
جو بھروسہ تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا

میں نے دیکھا ان کی زلفوں کو تو فرمانے لگے
آپ کا دل کھل پڑا گم ہو گیا جاتا رہا

مرگِ دشمن سے زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال
دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

کس قدر ان کو فراقِ غیر کا افسوس ہے
ہاتھ ملتے ملتے سب رنگ حنا جاتا رہا

اب کئی دن سے وہ رسم و راہ بھی موقوف ہے
ورنہ برسوں نامہ بر آتا رہا جاتا رہا

حضرتِ مومن داغ پر بھی بول اٹھے کہ قبلہ دل کھل پڑا یہ محاورہ آج ہی سننے میں آیا ہے - خیر آپ کی زبان سے جو ارشاد ہو وہ سند ہے - اور رنگ کا جانا ہماری سمجھ میں نہیں آیا یا رنگ اڑنا یا رنگ کا اڑنا تو سنتے آئے تھے - ساری محفل میں سناٹا چھا گیا کیونکہ لوگ ابھی ابھی ظفر کو دیکھ چکے تھے - حضرت داغ کچھ مسکرائے اور فرمایا - یہ چیزیں بچوں کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے - انھیں صاحبِ ذوق اور اہلِ نظر ہی جانتے ہیں - پھر بھی سنو ہم نہ بتائیں گے تو نوجوانوں کی راہنمائی کون کریگا - گرہ سے دل کا آزاد ہونا اور ایک طرف اس کی جرات کرنا دونوں باتیں پہلو بہ پہلو ہیں (حاضرین نے تالیوں سے تائید فرمائی -) اور رنگ حنا کا جانا بھی

درست ہے۔ جب رنگ اترتا ہے جو جاتا ہے اڑتا نہیں ہے (حاضرین نے پھر تالیوں سے تائید فرمائی اس پر حضرت مومن خاموش ہو کر بیٹھ گئے)۔ آپ کے بعد حضرت آتش نے اسی زمین میں اپنی غزل سنائی۔

غزل

توڑ کر تار نگہ کا سلسلہ جاتا رہا
خاک ڈال آنکھوں میں میری قافلہ جاتا رہا

کون سے دن ہاتھ میں آیا میرے دامان یار
کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا

خار صحرا پر کسی نے تہمت دزدی نہ کی
پاؤں کا مجنوں کے کیا کیا آبلہ جاتا رہا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

جب اٹھایا پاؤں آتش مثل آواز جرس
کوسوں پیچھے چھوڑ کر میں قافلہ جاتا رہا

یہ غزل حضرت آتش کے ابتدائی زمانہ کی ہے۔ ہر ایک شعر میں مشق نو کی ابتدائی کڑیاں منسلک ہیں۔ کسی نے داد نہ دی۔ صرف محدود حلقۂ احباب نے سراہا۔ آتش تاڑ گئے کہ غزل قابل داد نہیں تھی چنانچہ فوراً ہی جیب میں سے ایک کاغذ نکالا اور دوسری غزل پڑھ کر سنائی۔

غزل

زلف زیبا ہے قریب رخ جاناں ہونا
گنج کا سانپ کو لازم ہے نگہباں ہونا

نہ رلا مجھ کو اے دوریٔ کوئے مقصود
راہ میں ظلم مسافر کو ہی باراں ہونا

عشق نے حال کیا مردِ بے وارث کا
مرے اوپر ہے یقیں قبضۂ سلطاں ہونا

آفتِ جاں ہوئی اس رو سے کتابی کی یاد
راس آیا نہ مجھے حافظِ قرآں ہونا

داغِ چیچک کے سبب یا ذقنِ یار سے گرد
لطف رکھتا ہے لبِ چاہ چراغاں ہونا

بے طرح مجھ کو رلاتا ہے غمِ دوریٔ یار
ہو مبارک دہنِ گور کو خنداں ہونا

آتش اس دشت پہ سی ہی تجھے اللہ ملائے
تا کجا دوریٔ بلقیس و سلیماں ہونا

غزل کے پانچویں شعر پر کسی طرفدارِ آتش نے حضرت داغ سے کہا قبلہ شعر ملاحظہ ہو۔ حضرت داغ کچھ پا سے گئے۔ حضرت غالب تاڑ گئے نواب صاحب پر چوٹ کی گئی ہے۔ مرزا صاحب کب بخشنے والے تھے فوراً فی البدیہہ غزل کہی اور فرمایا۔ غزل کہنے کو سب کہہ لیتے ہیں لیکن آئینہ کو روشن کرنا فنِ لطیف ہے۔ یہ کہا اور غزل پڑھنی شروع کی۔

غزل

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرت قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہا ئے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

غزل کے ایک ایک شعر پر ہزار ہزار داد ملی۔ تاڑنے والے تاڑ گئے کہ غزل کے مطلع ہی میں درس و تدریس کے عمیق قصے مضمر ہیں۔ غزل کے آٹھویں شعر پر خوب قہقہے اڑے اور یہ شعر کئی بار کہوایا گیا۔ واقعی حضرت آتش اپنی شوخ بیانی پر پشیمان ہوتے۔ ان کے بعد مجمع عام میں سے مولانا حالی اٹھے اور شمع مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ قبلہ عالم۔ پانی پت سے ایک فقیر آیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کرے۔ یہ سنکر مرزا غالب نے غور سے دیکھا۔ ہمک کر اٹھے۔ مجمع کو چیرتے ہوئے گئے اور حالی کو گلے لگا کر خوب روئے اور فرمایا آپ اتنے دنوں کہاں رہے۔ انھوں نے فرمایا۔ ایک بزرگِ دین کے ارشاد پر مسدس کی تکمیل میں مصروف تھا وہ پوری ہوئی گویا ایک فرض پورا ہوا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ ہمیں سنائیں گے مولانا نے فرمایا نہیں میاں نہیں۔ اس محفل میں صرف ایک آدھ غزل کہہ سکوں گا۔ مرزا صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اسٹیج پر لے آئے حاضرین

حاضرین نے تالیوں سے استقبال کیا۔ مولانا نے ایک غزل سنائی۔

غزل

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
منہ اسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں باقی ہے وہی حرصِ گناہ
پھر کئے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا

آؤ اس کو لیویں، ہم جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے اُنس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجیے شیخ جو دعوےٰ کرے
اب بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

مولانا کی غزل نہایت پاکیزہ تخیل اور شستہ زبان کی متحمل ہے۔ غزل کے رنگ میں مرثیہ کہے ہیں اور وہ بھی ملتِ اسلامیہ کی شوکتِ رفتہ کی یاد میں۔ غزل بیحد پسند فرمائی گئی۔ شمع محفل نے حاضرین سے فرمایا کہ اس زمین میں کسی کے پاس غزل ہو تو سنائیے ہمیں جی سے پسند ہے سب خاموش بیٹھے رہے غالب نے فرمایا۔ ہم اپنے پیارے حالی کی غزل کہیں گے

حق یہ ہے کہ ہم سے یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ حالی کے مدِ مقابل کوئی دوسرا آئے۔ (خوب تالیوں کا شور ہوا) یہ دیکھ کر مرزا صاحب نے بیاض کھولی۔ اور غزل سنائی۔

غزل

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو سمجھیں ہم لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانہ یار سے اٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہیں
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

غزل کے خاتمہ پر محفل میں سناٹا چھا گیا۔ ایک ایک لفظ گوہر نایاب تھا مولانا حالی نے اٹھ کر فرمایا۔ اگر مرزا صاحب مجھ سے پہلے یہ غزل پڑھتے تو میں اپنی غزل ہاتھ سے رکھ دیتا۔ مرزا صاحب نے جواباً فرمایا۔ حضرت! جب آسمان پر آپ چمک رہے ہیں وہاں ہماری خاک بھی نہیں پہنچ سکتی ہم تو صرف شاعری کرتے ہیں کوئی فلاح کا کام نہیں کرتے۔ مولانا نے

مسکرا کر فرمایا۔ پیر و مرشد ابھی پیاس نہیں بجھی۔ مرزا صاحب کے لبوں پر ہلکا سا تبسم آگیا اور فرمایا تو غزل سنیئے۔

غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

تیرے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تیری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مقطع پر خوب قہقہے اڑے۔ مولانا حالی نے فرمایا۔ پیر و مرشد ہم تو اب بھی کم نہیں سمجھتے۔ اس فقرہ پر خوب تالیوں کا شور اٹھا۔ شمع محفل نے فرمایا

اس زمین میں اگر کوئی فی البدیہہ غزل کہے تو ہم جانیں - یہ کہنا تھا کہ حضرت داغ اٹھے اور فرمایا - اجازت ہو تو دو چار شعر عرض کردوں - شمع محلس نے فرمایا نواب صاحب کو بھی اجازت کی ضرورت ہے ارشاد فرمائیں ہم شوق سے سینگے نواب داغ صاحب نے اپنی نشست پر کھڑے ہوکر غزل کہی -

غزل

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا | کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا
کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا | ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا
جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا | تم ہی منصفی سے کہدو تمہیں اعتبار ہوتا
یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی | نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا
یہ مزا ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں | کوئی غیر غیر ہوتا کوئی یار یار ہوتا
ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے | اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

تمھیں ناز ہو نہ کیونکر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ رقم نہ ہاتھ لگتی نہ یہ افتخار ہوتا

غزل پر خوب داد ملی - مطلع مرزا صاحب نے دوبارہ سنا اور فرمایا اس سے بہتر مطلع اور کون کہہ سکے گا اور حضرت آپ کا مضمون کسی صاحب نے لیا ہے اور خوب بنھایا ہے - نام تو یاد نہیں وہ کون صاحب ہیں - فرماتے ہیں -

الفت کا تب مزا ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

لیکن آپ کا مصرعِ ثانی جس سادگی سے ادا ہوا ہے ایسے ہزار شعر اس پر قربان ہیں۔ خدا شاہد ہے آپ نے زبان کا حق ادا کر دیا ہے اگر کوئی اور ہوتا تو مصرعِ ثانی میں "مجھے" کو پہلے لاتا۔ اور یہی کہتا "نہ مجھے قرار ہوتا نہ تجھے قرار ہوتا" ان ادبی لفظوں کو آپ کے سوا کون ادا کریگا۔

حضرت داغ نے شکریہ ادا فرمایا۔ حاضرین نے تالیوں کے شور سے تعریف فرمائی۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ نواب صاحب اتنی جلدی کیا ہے کچھ ارشاد فرمایئے۔ شمع مجلس نے تائید فرمائی۔ حاضرین نے اصرار فرمایا۔ داغ صاحب مجبور ہو گئے۔ جیب سے کاغذ نکالا اور غزل پڑھی۔

غزل

یہ قول کسی کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
وہ کچھ نہیں کہتا کہ میں کچھ نہیں کہتا

ان کا بھی ہے کچھ سنتا کہ وہ کچھ نہیں سنتے
میرا یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

دیکھو تو ذرا چشمِ سخن گو کے اشارے
پھر تم کو یہ دعویٰ ہو کہ میں کچھ نہیں کہتا

خط میں مجھے اول تو سنائی ہیں ہزاروں
آخر یہی لکھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

تم کو یہی شایاں ہیں کہ تم دیتے ہو دشنام
مجھ کو یہی زیبا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مشتاق بہت ہیں مرے کہنے پہ اے داغ
یہ وقت ہی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ایک ایک شعر پر واہ وا۔ واہ وا کے نعرے لگے۔ مکرر ارشاد فرمایئے کہا گیا۔ اکثر شعر دوبارہ کہلوائے گئے۔ حضرت غالب کو غزل بہت پسند آئی۔ اور فرمایا واقعی آپ کہتے ہیں اور میں کچھ نہیں کہتا۔ اس فقرہ پر خوب تالیاں بجائی گئیں۔ داغ صاحب نے فرمایا۔ یہ حضرت کی سخن پروری ہے ورنہ حقیقت بالکل الٹ ہے۔ مرزا صاحب نے حاضرین سے فرمایا۔ بھئی ہم تو اس غزل پر غزل کہہ نہیں سکتے البتہ کسی نے طبع آزمائی فرمائی ہو تو شوق سے تشریف لے آئیے۔ سب خاموش بیٹھے رہے حضرت مومن اٹھے اور فرمایا۔ اجازت ہو تو دو چار شعر کہوں۔ مرزا صاحب نے ہاتھ بڑھا کر فرمایا۔ تشریف لائیے حضرت مومن سٹیج پہ تشریف لائے اور فی البدیہہ غزل کہی چونکہ مرزا صاحب نے حضرت مومن کو ایک مرتبہ کسی بات پر ٹوکا تھا اور وہ رنجش حضرت مومن کے دل میں تھی۔ چنانچہ قافیہ سے فائدہ اٹھایا اور تیر چلاگئے۔

غزل

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناصح یہ گلا کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میں بولوں تو چپ ہوتے ہیں اب آپ جبھی تک
یہ رنجش بیجا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کچھ غیر سے ہونٹوں میں کہے ہے یہ جو پوچھو
تو دو ہیں مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کب پاس پھٹکنے دوں رقیبوں کو تمہارے
پر پاس تمہارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناصح کو جو چاہوں تو ابھی ٹھیک بنا دوں
پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا کیا نہ کہے غیر گر بات نہ پوچھو — یہ حوصلہ میرا ہے کہ کچھ نہیں کہتا
کیا کہیے نصیبوں کو کہ اغیار کا شکوہ — سن سن کے وہ چپکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مت پوچھو کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ہاں تنگ دہانی کا نہ کرنے کے لیے بات — ہے عذر پہ ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اے چارہ گر و قابلِ درماں نہیں یہ درد — ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ہر وقت ہے دشنام ہر اک بات میں طعنہ — پھر اس پہ بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو — سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
سنتا نہیں وہ ورنہ یہ سرگوشیٔ اغیار — کیا مجھ کو گوارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

غزل کا ایک ایک شعر نشتر کا کام کر رہا تھا۔ مومن کے طرفداروں نے محفل سر پہ اٹھا لی۔ خوب داد دی۔ واہ واہ کے نعرے بلند کیے۔ مقطع کی کمان سے ایک ایسا تیر نکلا کہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ لیکن حضرت غالب کی ایسی ہزار محفلیں دیکھی ہوئی تھیں۔ اور سینکڑوں واقعات اپنی نگاہ سے گزارے ہوئے تھے وہ چیں بہ جبیں کیوں ہوتے دانا تھے دانائی سے کام لیا اور فرمایا بھئی مومن مقطع واقعی خوب ہے۔ خدا کے بندے اب بھی موجود ہیں جو پندرہ بیس نہیں تو دو چار شعر تو موقعہ پہ کہہ ہی لیتے ہیں۔ غزل بہت عمدہ کہتے ہیں آپ۔ معاملہ کو ختم کرنے کے لیے مرزا صاحب نے حضرت ظفر

سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ قبلہ آپ سے شکایت رہے گی۔ یہ بزمِ ادب ہے۔ یہاں خاموشی ہی حائلِ شرافت نہیں ہے۔ کچھ تو فرمائیے۔ حضرت ظفر اٹھے اور فرمایا۔ بہ تکمیل ارشاد دو چار شعر عرض کرتا ہوں۔ انہیں دنوں ایک غزل کہی ہے۔ ملاحظہ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

غزل

ہاں فروسوزِ دل اک دم ہوا پر ہوا
اور گریہ سے بڑھا کم ہوا پر ہوا

سنکے احوالِ جگر سوز غریب عاشق کا
ہائے افسوس تجھے غم ہوا پر ہوا

کشتۂ غمازکہ افسوس جنازہ پہ ذرا
چشم پُر آب تو اک دم ہوا پر ہوا

سنکے نالوں کو مرے ہو گئے پتھر پانی
سرِ مژگاں بھی ترانم ہوا پر ہوا

چارہ گر کی نہیں تقصیر بہت کی تدبیر
کارگر زخم پہ مرہم ہوا پر ہوا

رات ہمسایوں نے اٹھ اٹھکے دعائیں مانگیں
شورِ نالہ مرا مدھم ہوا پر ہوا

کھکھلا کر ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے
دل ہمارا خوش و خرم ہوا پر ہوا

اے ظفر دیکھیے عقبیٰ میں ہو کیا حال اپنا
چین دنیا میں تو اک دم ہوا پر ہوا

غزل عمدہ رہی شمعِ محفل نے داد دی اور چونکہ مرزا صاحب نے فرمائش فرمائی تھی اس لحاظ سے بھی مرزا صاحب نے خوب داد دی اور بڑے غور سے سُنی۔ حضرت ذوق نے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ حضرتِ

ظفر کی جبینِ سخن سے پچھلی سیاہی کو مٹانا چاہا۔ اٹھے اور اٹھ کر فرمایا۔ آپ کی دوسری غزل اسی زمین میں میرے پاس محفوظ ہے اگر پیر و مرشد اجازت بخشیں تو حضور کی غزل سنانے کی جرات کروں۔ حضرت ظفر معاملہ کو سمجھ گئے مسکرا کر فرمایا۔ قبلہ استاد اور ہم سے اجازت فرماتے ہیں۔ شمع محلس نے حضرت ظفر کی دوسری غزل سننے کا اشتیاق فرمایا۔

حضرتِ ذوق نے غزل سنائی۔

غزل

ہو آب شہادت سے گلو تر نہ ہوا
مستعد جب وہ ہوا ہاے تو خنجر نہ ہوا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا

بے چراغ اسکو نہ رکھ داغ الم سے اے عشق
خانۂ دل کوئی ویرانہ ہوا گھر نہ ہوا

کیا صبا آئی تیرے کوچے سے آیا رکہ میں
جوں حبابِ لبِ جو جامہ سے باہر نہ ہوا

ہم تو بیمارِ محبت ہیں خدا خیر کرے
کہ یہ آزاد ہوا جس کو وہ جانبر نہ ہوا

عشق یہ معجزہ کیسا ہے کہ اس کشتہ کے
موئے سر حلق سے پیدا ہوئے اور سر نہ ہوا

خونِ رگہاے گلو کب تنِ بے سر سے ظفر
آ کے کب جوش پہ فوارے سے ہمسر نہ ہوا

زبان فصاحت اور بلاغت شستگی و وارفتگی ۔ شوخی اور بندش صاف بتا رہی ہے کہ یہ غزل حضرت ذوق کی ہے ۔ ذوق نے محض حضرت ظفر کی

پاسداری فرمائی ہے۔ حضرت غالب مطلع سن کر ہی سمجھ گئے تھے۔ مطلع دوبارہ کہوایا اور داد دی اور فرمایا۔ بھئی ذوق! "ہائے تو خنجر کہوا،، آپ کی زبان سے خوب ادا ہوا ہے۔ حضرت داغ سب سمجھ گئے۔ مسکرا کر فرمایا۔ ع

اب سے وہ کام کرینگے کہ آساں ہوگا

حضرت غالب تاڑ گئے کہ حضرت داغ نے حضرت ظفر پر چشمک کی ہے حضرت ذوق کے تیور بدلتے دیکھ کر اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے کہ مشاعرہ میں کہیں تو تو میں میں کی نوبت نہ آجائے۔ مسکرا کر حضرت داغ سے فرمایا۔ نواب صاحب مصرع خوب ہے دو چار شعر اسی میں ہو جائیں تو لطف آجائے حاضرین نے تالیوں سے تائید فرمائی۔ حضرت داغ اٹھے اور فی البدیہہ غزل کہی اور اس زمین میں صرف پانچ شعر کہہ سکے۔

غزل

ہائے مہمان کہاں یہ غم جاناں ہوگا ۔۔۔ خانۂ دل تو کوئی روز میں ویراں ہوگا

کوستا ہوں جو نصیبوں کو تو کہتا ہے وہ شوخ ۔۔۔ پھر محبت نہ کرے گا اگر انساں ہوگا

زندگی عشق میں مشکل ہے تو مر جائیں گے ۔۔۔ اب سے وہ کام کریں گے جو آساں ہوگا

اب کہاں لخت جگر شیئے اے دیدۂ تر ۔۔۔ اور ہوگا تو سر گوشۂ داماں ہوگا

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا ہی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

غزل پر خوب داد دی۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ حضرت ردیف کو بدل کر غزل کہیئے تو مزا آئے۔ حضرت داغ ایک لمحہ کے لیئے خاموش رہے۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کی انگلی سے یونہی کچھ دیکھ رہے تھے گویا ردیف بدل کر مطلع کی فکر میں ہیں۔ مرزا صاحب سنیئے۔ حضرت داغ نے مسکرا کر کہا اور غزل سنانا شروع کی۔

غزل

کیا مرے ہاتھ سے کھنچکر ترا داماں نکلا
تو بھی آغوش سے پژمردہ میری جاں نکلا

دلِ سوزاں نے کہیں آگ نہ چھوڑی شب ہجر
صبح خورشید کے بدلے مہِ تاباں نکلا

قول پورا ہوا عہد شکن کے منہ سے
ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سخن وعدہ پیماں نکلا

شرمگیں چشم میں اس برقِ نظر کا جلوہ
ایک شعلہ ساتہِ دامنِ مژگاں نکلا

سختی دل کا مزا تجھ کو چکھاتا کافر
پر کروں کیا کہ خدا تیرا نگہباں نکلا

داغ دل چیر کے اس بت کو دکھانا ہی نہ تھا
آرزو نکلے تو نکلے مگر ایماں نکلا

مرزا صاحب نے غزل کی تعریف فرمائی۔ طرفدارانِ داغ نے خوب شور مچایا۔ نعرے لگائے۔ استاد داغ زندہ باد کا شور اٹھا۔ حریفوں میں سے ایک صاحب اٹھے اور مرزا صاحب سے مخاطب ہوئے۔ بولے مرزا صاحب اس زمین میں شعر کہیئے۔ ہم نے فرمائش اس لیئے کی ہے

کہ یہ کام بہت آسان ہے۔ اس فقرے نے مرزا صاحب کے دل پر ایک زخم کیا اور فرمایا۔ ہم نہیں چاہتے کہ نواب داغ کی غزل پر طبع آزمائی کریں۔ لیکن اربابِ ذوق کو اگر یہی منظور ہے تو ان کا اصرار سر آنکھوں پر۔ یہ کہا اور شعر کہنا شروع کیا اور کہیں نہ رکے گویا غزل حافظہ میں محفوظ تھی۔

غزل

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد — کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

لوگ شعر سن رہے تھے اور منہ میں انگلیاں لے رہے تھے۔ کچھ آنسو بہا رہے تھے کچھ سر دھن رہے تھے۔ حضرت ولی دکنی اٹھے سٹیج کے قریب پہنچے اور مرزا صاحب کے سامنے جھک کر تین بار سلام کیا۔ مرزا صاحب اٹھے، اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ ولی صاحب نے فرمایا۔ جو پودا ہم لوگوں نے لگایا تھا تم نے خونِ جگر سے اس کی پرورش کی ہے۔ حضرت داغ اٹھے اور مرزا صاحب سے

مخاطب ہوکر بولے۔ آئندہ جو اس زمین پر اس قافیہ کو باندھے گا۔ جھک مارے گا۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب کے سامنے اپنی غزل پھاڑ کر پھینک دی۔ مرزا صاحب کے دل پر خاص اثر ہوا اٹھے اور گلے سے لگا لیا۔ حاضرین نے تالیوں کے شور و غل سے ان دونوں کی صفائی کی تعریف فرمائی۔ شمع مجلس سنے حضرت میر تقی میر سے کہا۔ میر صاحب آپ بھی تو ارشاد فرمائیے۔ حاضرین نے تائید فرمائی۔ میر صاحب اٹھے ایک کاغذ نکالا اور غزل سنائی۔

غزل

گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

صد خانماں خراب ہیں ہر ہر قدم پہ دفن
کشتہ ہوں یار میں تو ترے گھر کی راہ کا

ایک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

تلوار مارنا تو بس کھیل ہے وے
جاتا رہے نہ جان کسو بیگناہ کا

بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال
احوال کچھ نہ پوچھئے اس روسیاہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو داد خواہ کا

اے تاج شہ نہ سر کو فرد لاؤں تیرے پاس
ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

بیمار تو نہ ہووے جے جب تلک کہ امیر
سونے نہ دیگا شور تیری آہ آہ کا

کس کی مجال تھی کہ میر صاحب کے شعر پر کوئی اعتراض کرتا سب نے نہایت اطمینان سے غزل سُنی - ان کے بعد شمع مجلس نے میر درد سے فرمائش کی - میر درد نے اٹھ کر کہا - میر صاحب کی بزرگی میرے لیے قابلِ احترام ہے - آپ کے بعد اس زمین میں میں کیا تخم ریزی کروں گا - البتہ ایک وقت تھا کہ طبیعت زوروں پر تھی اُس زمانے کی ایک غزل حافظہ میں محفوظ ہے - ملاحظہ کے لیے پیش کرتا ہوں -

غزل

اندازہ وہ ہی سمجھے میرے دل کی آہ کا — زخمی جو کوئی ہوا ہو کسی کی نگاہ کا
زاہد کو ہم نے دیکھ لیا جو نگیں پہ عکس — روشن ہوا ہے نام تو اس روسیاہ کا
ہر چند فسق میں تو ہزاروں ہیں لذتیں — لیکن عجب مزہ ہے فقط دل کی چاہ کا
لیکر ازل سے تا اَبد ایک آن ہے — گر درمیان حساب نہو سال و ماہ کا
رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تیری ادھر — یارب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا
دل اس مزدہ سے رکھیو نہ تو چشم راستی — اے بیخبر برا ہے یہ فرقہ سپاہ کا
شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں — نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا
سو بار دیکھی مینے تیری بیوفائیاں — تس پر بھی نت غرور ہے دل میں نباہ کا

اے درد چھوڑتا ہی نہیں مجھکو جذبِ عشق
کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

مرزا صاحب نے داد دی اور فرمایا درد کی ہر بات میں درد ہے اور یہ درد ازلی ہے۔ درد صاحب نے اٹھ کر سلام کیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا ایک غزل ہمارے پاس بھی ہے سنو۔

غزل

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید زدام جستہ ہے اس دامگاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی ہے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

حاضرین نے بہت تعریف فرمائی۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ آپ کو غزل پسند آئی، شکریہ! یہ کلام اس زمانے کی یادگار ہے۔ جن دنوں میں اسد تھا۔ گذرے ہوئے زمانے کی یاد ہے کہ سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔ اور میر درد سے فرمایا۔ میر صاحب اگر کوئی اور غزل یاد ہو سنایئے حاضرین نے تالیوں سے تائید فرمائی۔ میر درد نے کاغذ نکالا جسکے دونوں طرف غزلیں لکھی ہوئی تھیں۔ میر درد نے فرمایا۔ چند شعر عرض کرتا ہوں

اشعار

ﮯ مخالف کٹ گئے سنتے ہی مجلس میں سخن میرا
زباں کا اب ہوا معلوم جوہر تیغ ہے گویا

ﮯ بارے مجھے بتا تو سہی کیا سبب ہوا
پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو غضب ہوا

ﮯ رسوائیاں اٹھائیں جور و عتاب دیکھا
عاشق تو ہم ہوئے پر کیا کیا عذاب دیکھا

ﮯ آشیانے میں درد بلبل کے
آتشِ گل سے آج پھول پڑا

اس کے بعد حضرت درد نے معذرت چاہی۔ شمع مجلس نے بہت شکریہ ادا کیا۔ درد صاحب نے سلام کیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے شمع مجلس نے حاضرین سے فرمایا۔ اب ردیف بائے موحدہ شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ جس صاحب کو ردیف الباء میں غزل پڑھنی ہو۔ تشریف لائے اور آغاز فرمائے۔

سب سے پہلے حضرت میر تقی میر اٹھے شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی اور غزل پڑھی۔

غزل

رُویا کئے ہیں غم سے تیرے ہم تمام شب
پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام رات

رکنے سے دِل کے آج بچا ہوں تو اب جیا
چھاتی ہی میں رہا ہے مرا دم تمام شب

یہ اتصال اشکِ جگر نور کا کہاں
رُوتی تو ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب

شکوہ عبث ہے مہر کہ کڑھتے ہیں سارے دِن
یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب

گذرا کئے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

غزل پر خوب داد ملی کئی شعر دوبارہ کہوائے گئے۔ شمع مجلس نے بھی غزل کو سراہا ان کے بعد حضرت مومنؔ اُٹھے اور شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی اور اسی زمین میں ایک غزل پڑھی۔

غزل

تھی وصل میں بھی فکرِ جدائی تمام شب
وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

واں طعنۂ قہر بار یہاں شکوہ زخم ریز
باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

رنگین ہیں خون سر سے وہ ہاتھ آجکل رہے
جس ہاتھ میں وہ دستِ حنائی تمام شب

تالو سے یاں زبان سحر تک نہیں لگی
تھا کس کو شغلِ نغمہ سرائی تمام شب

یکبار دیکھتے ہی مجھے غش جو آگیا
بھولے تھے وہ بھی ہوش ربائی تمام شب

مر جاتے کیوں نہ صبح کے ہوتے ہی ہجر میں
تکلیف کیسی کیسی اٹھائی تمام شب

گرم جواب شکوۂ جور عدو رہا
اس شعلہ خو نے جان جلائی تمام شب

کہتا ہے مہوش تمھیں کیوں غیر گر نہیں
دن بھر ہمیشہ وصل جدائی تمام شب

دھر پاؤں آستاں پہ کہ اس آرزو میں آہ
کی ہے کسی نے ناصیہ سائی تمام شب

مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں
ان کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

حضرت مومن کی غزل بہت پسند فرمائی گئی۔ اس کے بعد شمع محفل نے دوسرے شعراء کرام سے استدعا فرمائی کہ اگر کوئی صاحب اس زمین میں اس بحر میں غزل کہنا چاہے تو تشریف لائیے لیکن کوئی نہ اٹھا۔ حضرت آتش اٹھے اور فرمایا۔ پیر و مرشد ردیف کی قید تو احسن ہے لیکن بحر کی قید بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ شمع محفل سمجھ گئے اور فرمایا۔ آپ کی رائے گرامی کا بزم ادب مشکریہ ادا کرتی ہے۔ کہ آپ اس ردیف میں اپنے کلام سے مستفید فرمائیں۔ حضرت آتش سٹیج کی طرف بڑھے۔ حاضرین نے تالیوں سے خیر مقدم فرمایا۔ حضرت آتش نے ردیف الیاء میں غزل پڑھی۔

غزل

ہر حال میں ہے اپنے مرا یار دلفریب
گفتار دلفریب ہے رفتار دلفریب

مژگانِ چشم یار کی تعریف کیا کروں
جانکاہ جاں خراش دل آزار دلفریب

اندازِ حسنِ یار ہیں اک اک سے خوشنما
رکھتا ہے ہر شگوفہ یہ گلزار دلفریب

مشتاق زخم کے ہیں اے ترک کشتنی
ابرو سے تیرے ہوتی ہی تلوار دلفریب

دنیا میں آ کے جی نہیں جانے کو چاہتا
دلکش ہر اک دکان ہی بازار دلفریب

سودائے عشق کیلئے ہے خوش جمال شرط
یہ جنس چاہتی ہے خریدار دلفریب

عالم میں مجھ کو قاتلِ خوش رو کی ہے تلاش
جلاد ڈھونڈتا ہے گنہگار دلفریب

دیوان حسن میں سے ہو اک بیت انتخاب
کیونکر نہ ہو وہ ابروئے خم دار دلفریب

اس گل نے گوشِ دل سے سنا یکدن آہ حیف
آتش یہ کیسے ہیں تیرے اشعار دلفریب

ہر شخص نے غزل کی داد دی۔ واہ واہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ حضرت آتش نے دوسروں کے لیے راہیں کھولدیں۔ ان کے بعد حضرت خواجہ میر درد اٹھے۔ شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی۔ سٹیج پر تشریف لائے اور ردیف الباء میں غزل پڑھی۔

غزل

تھا عدم میں بھی مجھے اک پیچ و تاب
مضطرب ہو جس طرح موجِ شراب

بے صناعت ہیں سب اہلِ ذوقِ برق
چشمۂ خورشید میں کدھر ہے آب

موت ہے آسائشِ افتادگاں
چشمِ نقشِ پا کا مٹ جاتا ہے خواب

کیوں نہ ہو شرمندۂ روئے زمین
سیلِ اشک ایسا نہیں خانہ خراب

ہے تنگ ظرفوں کو بیجا مے کشی — جام مے کب ہو سکے جامِ حباب
جل نہ جاویں ہیں جو صاحب حوصلہ — پاتے خم لغزش ہیں کب لاوے شراب
ہستی میں کوئی کبھو دل مردگان — گو رہے لب پر تبسم کیا حساب
مے کشاں کرنے لگے محنت کشی
درد ہوتا ہے دلِ یاراں کباب

غزل کو بہت پسند فرمایا گیا۔ شعر شعر پر داد ملی۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی خواجہ سیّد محمد آثرؔ نے غزل سنائی۔

غزل

زیست ہونی تعجبات ہے اب — مر ہی جانا بس ایک بات ہے اب
دور میں تیرے ہے وہ کچھ اندھیر — نہیں معلوم دن ہی رات ہے اب
دل ہی زندہ نہ جی ہی جیتا ہے — زندگی بدتر از ممات ہے اب
اتنے بے دید بے شنید ہوئے — نہ توجہ نہ التفات ہے اب
ہجر کیا وصال ہو بالفرض — کچھ ہی صورت ہو مشکلات ہے اب
جی ہی لینا بہ لطف ہی منظور — اس قدر جو تفضلات ہے اب
جیتے جی تو رہا وصال محال — مر چکے پر توقعات ہے اب
کچھ نہ پوچھو آثر کی بے چینی
نہ سکونت ہے نے ثبات ہے اب

شمع محفل نے حضرت اثر کا تعارف فرمایا چونکہ غزل بہت بلند پایہ کی تھی اس لئے حاضرین نے قدر افزائی فرمائی۔ آپ کے بعد حضرت نواب داغ اٹھے اور شمع محفل سے اجازت طلب فرمائی۔ سٹیج پر تشریف لائے اور ردیف الباء میں غزل پڑھی۔

غزل

دلِ ناکام کے ہیں کام خراب
کر لیا عاشقی میں نام خراب

اس خرابات کا یہی ہے مزہ
کہ رہے آدمی مدام خراب

زلف ہے چور چشم یار شریر
حسن کا سب ہی انتظام خراب

دیکھ کر جنسِ دل وہ کہتے ہیں
کیوں کرے کوئی اپنے دام خراب

ابرِ تر سے صبا ہی اچھی تھی
میری مٹی ہوئی تمام خراب

وہ بھی ساقی مجھے نہیں دیتا
وہ جو ٹوٹا پڑا ہے جام خراب

کیا ملا ہم کو زندگی کے سوا
وہ بھی دشوار ناتمام خراب

واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں
خوبرو ہو کے یہ کلام خراب

چال کی رہنمائے عشق نے بھی،
وہ دکھایا جو تھا مقام خراب

داغ ہے بد چلن تو ہونے دو
سو میں ہوتا ہے اک غلام خراب

مرزا صاحب نے فرمایا! حضرت مقطع میں آپ کیا فرما گئے! محفل میں خوب

قہقہے اڑے۔ حضرت داغ نے فرمایا۔ قبلہ اِس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ ایکبار پھر قہقہے اڑے۔ شمع محفل نے حضرت ذوق سے فرمایا۔ صاحب ذوق کیوں خاموش بیٹھے ہیں! اِس جملہ پر تالیوں کا شور اٹھا۔ حضرت ذوق مسکراتے ہوئے اٹھے۔ سٹیج پر تشریف لائے۔ جیب میں سے ایک لمبا چوڑا کاغذ نکالا اور غزل پڑھی۔

غزل

پی بھی جا ذوق نکر پیش وپسِ جامِ شراب
لب پہ توبہ تیرے دل میں ہوسِ جامِ شراب

دستِ بدمست سے کی ٹوٹ کے فریاد بہت
نہوا کوئی بھی فریاد رسِ جامِ شراب

محتسب شعلۂ آواز سے جل جاؤ نگا
گرچہ ٹوٹا دلِ آتش نفسِ جامِ شراب

رات میخانے میں ساقی جو نشے میں بہکا
خسِ شیشہ کو لگا کہنے خسِ جامِ شراب

دل شکستہ ہوں وہ میں ٹوٹ کے ہوں سو ٹکڑے
نام لکھ دے جو کوئی میرا پسِ جامِ شراب

بے خبر قافلۂ عیش گذر جاتا ہے
بے زبان ہے جو دہانِ جرسِ جامِ شراب

بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا
عکسِ مژگاں تیرا امیکش ہی خسِ جامِ شراب

ذوق جلدی مئے گلرنگ سے بھر ساغرِ مُل
لبِ نازک کو ہوا سکے ہوسِ جامِ شراب

حضرت ذوق کی غزل پسند فرمائی گئی۔ سننے میں آیا ہے کہ غزل اُنیس اشعار میں پھیلی ہوئی تھی لیکن محفل کا رنگ دیکھ کر صرف آٹھ اشعار انتخاب

…رماتے - حضرت ظفر نے استاد سے کہا - قبلہ آپ نے تو انیس شعروں کی غزل …ہی تھی - گیارہ شعر کیا ہوئے ؟ اس پر حضرت ذوق نے جواباً فرمایا - موقعہ کے لحاظ سے وہ شعر میری اپنی نظر میں زیادہ وزنی نہیں ہیں اس لیئے وہ نہیں پڑھے گئے - ان کے بعد حاضرین نے حضرت غالب سے اصرار فرمایا کہ وہ اس ردیف میں کوئی غزل ارشاد فرمائیں - چنانچہ مرزا صاحب نے اپنی ایک پرانی غزل سنا دی ان کی نگاہ میں یہ غزل بلند پایہ نہ تھی - لیکن صاحبِ ذوق لوگوں نے اس قدر تعریف کی کہ مرزا صاحب کو یہ گمان گذرا کہ کہیں بیجا تعریف تو نہیں ہو رہی - لیکن حضرت ذوق جیسے اساتذہ کلام نے اٹھ کر اپنی غزل پھاڑ کر پھینک دی تو مرزا صاحب کو یقین ہوا کہ ان کی غزل سب پر بھاری رہی ہے - اربابِ ذوق کے لیے غزل پیش کرتے ہیں -

غزل

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب / دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن / سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے / سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر / موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو / موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز / دے ہے تسکین بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑی ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

حضرت غالب کے بعد حضرت میر تقی میر۔ حضرت مومن اور حضرت داغ نے ہم طرح غزلیں ردیف الباء میں پڑھیں۔ حضرت میر نے غزل پڑھی ان کے بعد حضرت مومن نے غزل پڑھی اور آخر میں حضرت داغ نے غزل پڑھی۔

غزل میر تقی میر

وہ جو کشش تھی اسکی طرف سے کہاں ہے اب
تیر و کمان ہے ہاتھ میں سینہ نشاں ہے اب

اتنا بھی منہ چھپانا خط آئے پر وجہ کیا
لڑکا نہیں ہے نام خدا تو جواں ہے اب

پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا جھڑے ہیں ہائے
سیلِ بہار آنکھوں سے میری رواں ہے اب

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے
بارِ گرانِ عشق و دلِ ناتواں ہے اب

نکلی تھی اس کی تیغ ہوئے خوش نصیب لوگ
گردن جھکائے میں تو سنا یہ اماں ہے اب

زردی رنگ ہے غمِ پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھ ہے منہ سے ہمارے عیاں ہے اب

...س از دمِ سحر مرا رونا لہو کا دیکھ — پھولے ہے جیسے سانجھ وہی یاں سماں ہے اب

...س ہوئے کہ یاد ہمیں سب کو دے گئے — گلشن میں عندلیب ہماری زباں ہے اب

برسوں ہوئے گئے اسے پر بھولتا نہیں

یادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہے اب

غزل حضرت مومن دہلوی

قتل عدو میں عذر نزاکت گراں ہے اب — مجھ میں ستم اٹھانیکی طاقت کہاں ہے اب

وحشت سے میری سارے احباب چلے گئے — آنا ہے گر تو آؤ کہ خالی مکاں ہے اب

سجدے پہ سر قلم ہو دعا پر زباں کٹے — گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

قتلِ عدو نے شوقِ شہادت مٹا دیا — لب پر ہمارے غلغلۂ الاماں ہے اب

پیری میں وصلِ غیرتِ یوسف ہوا نصیب — بختِ وفا مثالِ زلیخا جواں ہے اب

کہہ دیں رقیب نے تیری بے التفاتیاں — ناصح ہمارے حال پہ کچھ مہرباں ہے اب

رکھے ہے سر اپنے زانوئے نازک پہ شوق سے — تیرا مریضِ عشق بہت ناتواں ہے اب

چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا — جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب

وہ دن گئے کہ لاف و گزافِ جہاد تھا

مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

غزل حضرت داغ دہلوی

ہم مٹ گئے تو پرسشِ نام و نشاں ہو اب
اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

میں کیا کروں بلا سے جو تو مہرباں ہو اب
وہ دل کہاں ہو اب وہ طبیعت کہاں ہے اب

ہرگز نہ تھا زمانۂ سابق میں یہ فلک
جس آسماں کی دھوم ہے وہ آسماں ہے اب

بے مہر و بے وفا و دل آزار و دل ستاں
جی ڈھونڈتا ہے وہ پیدا کہاں ہے اب

تم پارسا سہی مگر اتنا تو سوچ لو
کچھ دیکھ ہی لیا ہے جو دل بدگماں ہے اب

ان ظالموں میں فرق نہیں میرے واسطے
نامہرباں ہے وہ تو فلک مہرباں ہے اب

ظالم کہیں خدا نہ کرے تو سنے اسے
جو کچھ شبِ فراق میں وردِ زباں ہے اب

اللہ وہ زمانۂ تاثیر کیا ہوا
کہنے کیواسطے میرے لب پر فغاں ہے اب

بیٹھے ہیں ہم بھی گوش بر آواز کہہ تو دو
آنا ہے جس کو آئے یہاں امتحاں ہے اب

قربان جاؤں دردِ جگر کے پکڑ کے ہاتھ
یہ پوچھتے ہیں مجھ سے بتاؤ کہاں ہے اب

ملنے کے بعد رنج اٹھائے ہیں اسقدر
شکرِ وصال بھی میرے لب پر فغاں ہے اب

کیا کیا ملائے خاک میں انسان چاند سے
سچ پوچھئے اگر تو زمیں آسماں ہے اب

مدت ہوئی کہ داغ کو سنتے تھے سوئے دیر
کیا جانے وہ جدائی کا مارا کہاں ہو اب

اس کے بعد شمع محفل نے اٹھ کر فرمایا۔ اگر کسی صاحب نے اس ردیف میں غزل پڑھنی ہو تو تشریف لے آئیے۔

مگر کوئی نہ اٹھا۔ چنانچہ میر مشاعرہ نے فرمایا۔ بزم ادب کی طرف سے یہ اعلان نہایت مسرت سے سنا جائے گا کہ اب مشاعرہ آزاد روش اختیار کرتا ہے یعنی صاحب ذوق اپنی پسندیدہ غزل پیش فرمائیں اور جس کا جی چاہے غزل پر غزل کہے۔ مدعا یہ کہ ارباب سخن آزاد ہیں۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں۔

استاد ذوق اُٹھے اور شمع مجلس سے فرمایا۔ اجازت ہو تو قبلہ حضرت مخدومی ظفر صاحب کی غزل پیش کردوں۔ شمع مجلس نے فرمایا جب وہ خود موجود ہیں تو پھر ہم ان کی زبان سے سننے سے محروم کیوں رہیں۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں جس سے مدعا یہ تھا کہ حضرت ظفر خود ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ حضرت ظفر سٹیج پر تشریف لائے اور غزل پڑھی۔

غزل

قدر اے عشق رہے گی تیری کیا میرے بعد
کہ تجھے کوئی نہیں پوچھنے گا میرے بعد

زخم پر دل کے گوارا ہے مجھے تو یہ نمک
کون چکھے گا محبت کا مزہ میرے بعد

درِ جاناں سے میری خاک نہ کرنا برباد
دیکھ جانا ہو اگر بادِ صبا میرے بعد

خاک صحرائے جنوں یونہی اگر نیز رہے
کوئی آئے گا نہیں آبلہ پا میرے بعد

میرے دم تک ہے تیرا لے دلِ بیمار علاج
کوئی کرنے کا نہیں تیری دوا میرے بعد

اس ستمگر نے مجھے جرمِ وفا پر مارا
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

اے ظفر کیونکہ محبت کو نہ ہو غم تیرا
کوئی غمخوارِ محبت نہ ہوا میرے بعد

غزل بہت پسند فرمائی گئی۔ حضرت ظفر نے یہ غزل عجیب دردناک لہجہ میں پڑھی۔ طرزِ ادا سے معلوم ہوتا تھا کہ واردات ہیں جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر زبان پر آرہی ہیں۔ ہر شعر پر واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے اور تالیوں کا شور اٹھا۔ ان کے بعد حضرت آتش اٹھے اور شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی اور حضرت ظفر کی غزل پر غزل پڑھی۔ حضرت آتش کی آتش بیانی نے محفل میں آگ لگا دی۔ شعر کیا تھے سلگتی ہوئی چنگاریاں تھیں کہ جہاں پڑیں جلائے بغیر نہ رہیں۔

غزل

قبر پر یار نے قرآن پڑھا میرے بعد
شرطِ الفت کی ملی مجھ کو جزا میرے بعد

ہو گیا سلسلۂ مہر و محبت برہم
نازنیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

رنگِ رخسارِ گل و لالہ دگرگوں ہوگا
نہ رہیگی یہ گلستاں کی ہوا میرے بعد

زندگی تنگ ہیں قیامت کے یہ سارے جھگڑے
مجھ کو کیا غم ہے اگر حشر ہوا میرے بعد

خونِ ناحق کا میرے کھینچے گا خمیازہ
ہاتھ ملے گا بہت مل کے حنا میرے بعد

قفسِ تن سے چھٹا میں تو چمن سے لاکر
بوئے گل کس کو سنگھائیگی صبا میرے بعد

میں نہ ہونگا تو نہ ہوگا یہ قمارِ الفت
کوئی بدلے کا نہیں شرطِ وفا میرے بعد

آئینہ رکھ کے بنانے کے نہیں شانے سے
مختصر ہووے گی یہ زلفِ سیاہ میرے بعد

قبر پہ فاتحہ کو آئے نہ شوخ اے آتش
نیک توفیق دے اس بت کو خدا میرے بعد

حضرت آتش کے بعد حضرت امیر مینائی اُٹھے اُنکے اُٹھنے پر تالیوں کا شور اٹھا۔ آپ ابھی شمع محفل سے حسب دستور اجازت بھی طلب نہ فرمانے پائے تھے کہ شمع محفل نے اٹھ کر دونوں ہاتھ بڑھا کر فرمایا سر آنکھوں پر تشریف لائیے۔ ایک بار پھر تالیوں کا شور اٹھا۔ آپ خراماں خراماں اپنی بزرگی کی شان کے ساتھ سٹیج پر تشریف لے گئے۔ حضرت غالب اور حضرت ولی نے اٹھ کر استقبال فرمایا۔ آپ نے حضرت آتش کی غزل پر غزل پڑھی جس کا مطلع ہے۔ ع۔

کون اٹھائیگا تمھاری یہ جفا میرے بعد

حضرت امیرِ مینائی کی غزل بیحد پسند فرمائی گئی۔ خوب قہقہے اڑے تالیوں کا شور اٹھا۔ واہ وا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ محفل کی محفل جھوم رہی تھی۔ اربابِ سخن سر دھن رہے تھے۔ جب گوہر نایاب کی لڑیوں کا سلسلہ مقطع پر ختم ہوا تو لوگوں نے سر اٹھائے۔ کسی کی زبان پر آہ تھی اور کسی کی لب پر واہ۔

غزل

کون اٹھائیگا تمھاری یہ جفا میرے بعد
یاد آئیگی بہت میری وفا میرے بعد

ہوں وہ نالاں کہ یہی اتنے لیئے ہوگی خوشی
چین سے سوئیگی سب خلقِ خدا میرے بعد

جتنا جی چاہے بلاؤں میں پھنسا لو مجھ کو
کوئی پاؤ گے نہ مشتاقِ بلا میرے بعد

ہے وصیت میری مرقد پہ یہ لکھیں احباب
کہ کرے کوئی کسی سے نہ وفا میرے بعد

شکر ہے کچھ تو محبت میں ہوا رنگ اثر
تین دن اس نے لگائی نہ حنا میرے بعد

کون ماتم میں ہے یوں دل کا جلانے والا
گل ہوئی شمع مزارِ شہدا میرے بعد

ضعف میں ہے تنِ مجنوں بھی مہِ نو لیکن
ہے وہ عالم میں تو انگشت نما میرے بعد

مر گیا ہوں میں صنم تیری فراموشی پر
یاد کرنا ہے مجھے بہرِ خندہ نما میرے بعد

تھا وہ بلبل کہ جگر میں میرے کانٹا کھٹکا
چمنِ حسن میں جو پھول کھلا میرے بعد

خوں میرا کر کے بہت ہاتھ ملے قاتل نے
نہ جما پر نہ جما رنگِ حنا میرے بعد

تھی میرے دم سے فقط اس کے ستم کی تیزی
نہ رہی جوہرِ شمشیرِ دغا میرے بعد

میرے مرتے ہی ملا خاک میں یہ اوجِ جنوں
دشت میں کوئی بگولا نہ اٹھا میرے بعد

نگہِ ناز سے مارا نہ کسی کو اس نے
یار سے کھنچ نہ سکی تیغِ ادا میرے بعد

خوش خطوں نے نہ کسی کو بھی کیا زیر و زبر
یک قلم چھوٹ گئی مشقِ جفا میرے بعد

زینتِ محفلِ اربابِ سخن تھا میں امیر
نہ رہی رونقِ بزمِ شعرا میرے بعد

حاضرینِ جلسہ نے حضرت مرزا غالب سے اصرار فرمایا کہ آپ بھی اس قافیہ ردیف میں غزل فرمائیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ بھئی حضرت امیر مینائی کے بعد غالب کیا کہے گا! بھری محفل میں سے ایک صاحب اٹھے اور بولے۔ اگر غالب ہو تو ضرور کہے گا ورنہ غالب نہیں۔ مرزا صاحب مسکرائے اور فرمایا۔ کاش میں غالب نہ ہوتا اسد ہی رہتا۔ اس شخص نے جواباً کہا۔ پھر بھی غالب رہتے۔ مرزا صاحب ہنس پڑے۔ محفل میں قہقہوں کا غل ہوا تالیوں کا شور اٹھا۔ مرزا صاحب مجبور ہو گئے۔ کاغذ نکالا اور اس زمین

ان کو جو ہیں میں جیب کاغذ کہ ہے افسوس مجھے ۔ فرمایا ۔ پائی نہ غزل کوئی میں
میں اس زمین میں کوئی غزل نہیں ملتی۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے مذاق کے انداز میں فرمایا ۔ تو فی البدیہہ فرما دیجئے ۔ اگر کوئی دوسرا کہتا تو شاید مرزا صاحب اس فرمایش کو ٹال جاتے مگر شمع محفل کی فرمایش اور بھری محفل میں کیسے ٹالتے جب کوئی راستہ نہ ملا تو کاغذ سامنے رکھا قلم اٹھایا اور شعر لکھنے شروع کر دئے ، مرزا صاحب کے ماتھے پر تیور تھے اور آنکھیں گھٹی ہوئیں گویا یہ فرمایش ناگوار گذری ہے ۔ نو شعروں کی غزل کہہ کر قلم رکھ دیا اور فرمایا ۔ اہلِ ذوق توجہ فرمائیں ۔

غزل

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون کہتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

قطعہ سن کر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حضرت امیر مینائی نے اٹھ کر فرمایا۔ مرزا صاحب کے تخلص کا انتخاب ذہنی نہیں الہامی معلوم ہوتا ہے مرزا صاحب نے تعریف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ محفل میں حکیم آغا جان عیشؔ جو پہلے درجے کے شگفتہ مزاج تھے یہ بھی تشریف فرما تھے خدا جانے کس بات پر مرزا صاحب سے بگڑے ہوئے تھے کہ دل میں خلش تھی۔ ان کے قریب انکے دوست بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک صاحب اٹھے اور مرزا صاحب سے کہا۔ قبلہ آپ کا یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا بے ادبی معاف ہو ذرا تشریح فرما دیجیے شعر یہ ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مرزا صاحب تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ لوگ ان کا کلام نہیں سمجھتے چنانچہ اس موقع پر انھیں بہت رنج ہوا وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ لوگ منتظر تھے کہ مرزا صاحب اس شعر کی تشریح فرمائیں گے کہ فوراً ہی حکیم عیشؔ نے اٹھ کر یہ قطعہ پڑھا۔ غالباً یہ ایک منظم سازش تھی جس کے لیے یہ لوگ تیار ہو کر آئے تھے۔

قطعہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس پر محفل میں خوب قہقہے اڑے شور اٹھا۔ غل ہوا۔ کئی طرح کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شمع مجلس نے حاضرین کو خاموش کیا۔ مرزا صاحب نے غم آلود لہجہ میں اس وقت تک ایک شعر کہا اور بلند آواز سے سنایا ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

حضرت ذوق نے اٹھ کر فرمایا۔ پیر و مرشد اس وقت تو آپ کو یہ شعر پڑھنا چاہیئے تھا۔ ؎

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اسنے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مرزا صاحب نے نہایت دانائی سے کام لیا جو دشمنوں کی بات کو زیادہ تلخ محسوس نہ کیا اور ہنس کر معاملہ کو نظر انداز فرما دیا۔ مرزا صاحب کی وانشوری تھی جو رقیب یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اس کے بعد خواجہ میر درد حضرت امیر مینائی۔ جناب مومن اور حضرت غالب نے ہم طرح غزلیں پڑھیں جن کی زمین تھی اضطراب میں نقاب میں۔ عذاب میں۔ شراب میں۔ سب سے پہلے خواجہ میر درد نے غزل پڑھی۔ ان کے بعد حضرت امیر مینائی نے اپنی غزل سنائی

پھر جناب مومن نے غزل پڑھی اور آخر میں حضرت غالب نے اپنا کلام سنایا۔

غزل

بستی ہے جبتک ہم ہیں اسی اضطراب میں
جوں موج آ پھنسے ہیں عجب پیچ وتاب میں

نے خانہ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رہتا ہے کون اس دلِ خانہ خراب میں

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہی جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا سراب میں

غافل جہاں سے کے دید کو مفت نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں

ہر جزو کو کل کے ساتھ بمعنی ہے اتصال
دریا سے در جدا ہی یہ ہے غرق آب میں

پیری نے ملک تن کو اجاڑا وگرنہ ہاں
تھا بندوبست اور ہی عہدِ شباب میں

میں اور مجھسے ورد خریداری بتاں
ہی ایک دل بساط میں سو کس حساب میں

غزل امیر مینائی

جب کھینچے برو چھپاتے ہیں عارض نقاب میں
کہتا ہے حسن میں نہ رہوں گا حجاب میں

ہے قصد لکھدیا ہے گلا اضطراب میں
دیکھوں کہ کیا وہ لکھتے ہیں خط کے جواب میں

بجلی چمک رہی ہے فلک پر سحاب میں
اے دختِ رز کو چھپی کہاں ہے حجاب میں

اللہ رے میرے دل کی تڑپ اضطراب میں
گھبرا کے کر دئیں جو وہ لیتے ہیں خواب میں

قاضی بھی اب تو آئے ہیں بزمِ شراب میں
ساقی ہزار شکر خدا کی جناب میں

جا پائی خط نے اسکے رخِ بے نقاب میں
سورج گہن پڑا شرفِ آفتاب میں

دامن بھرا ہوا تھا جو اپنا شراب میں
محشر کے دن بٹھائے گئے آفتاب میں

رکھا یہ تم نے پائے حنائی رکاب میں
یا پھول دئے طبقِ آفتاب میں

راحت کہاں ہو اسکو جو ہے پیچ و تاب میں
دیکھا نہ پائے موج کو کفشِ جناب میں

ساقی مسیحِ وقت ہے بزمِ شراب میں
دیتا ہے بھر کے مئے قدحِ آفتاب میں

خط اسکے روئے تاب میں نکلا غضب ہوا
مانندِ ماہ داغ لگا آفتاب میں

پیری میں یہ جھکی ہوئی پلکوں کا حال ہے
دیواریں جیسے خم ہوں مکانِ خراب میں

مے خانے میں جو آئے تو ناصح رہے خموش
دم مارنے کی جا نہیں انساں کو آب میں

دامن میں انکے خون کی چھینٹیں پڑی امیر
بسمل سے پاس ہو نہ سکا اضطراب میں

ہر مطلع کے بعد لوگوں کو گمان گذرتا تھا کہ اب شعر پڑھیں گے لیکن پھر مطلع پڑھتے۔ دس مرتبہ ایسا ہوا اور ہر مطلع پر تالیاں بجیں اور واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے، غزل بے حد پسند فرمائی گئی۔ ان کے بعد کسی کی جرأت نہ پڑی کہ اس زمین میں غزل پڑھے۔ حالانکہ بہتوں کے پاس غزلیں تھیں حاضرین نے حضرت غالب سے اصرار فرمایا کہ وہ اپنی مطبوعہ غزل سنائیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ بھئی جب وہ طبع ہو چکی ہے لوگوں کی نظر سے گزر چکی ہے تو پھر مکرر پڑھنا کیا ضرور ہے۔ لیکن کسی نے ایک نہ

سنی اور اپنے اصرار پر قائم رہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر مرزا صاحب کو غزل سنانی پڑی۔ لیکن مرزا صاحب نے پیشتر اس کے کہ خود اپنی غزل سنائیں حضرت مومن سے کہا کہ وہ بھی اپنی غزل پڑھیں چنانچہ ڈرتے ڈرتے حضرت مومن نے غزل سنا دی۔ حالانکہ دو غزلہ کہہ کر لائے تھے۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔

غزل مومن

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

اتنی کدورت اشک میں حیران ہوں کیا کہوں
دریا میں ہے سراب کہ دریا سراب میں

تم نکلے بہر سیر تو نکلے گا مہر بھی
ہو وے گا اجتماع شب ماہتاب میں

کھولا جو دفتر گلہ اپنا زباں کیا
گذری شب وصال ستم کے حساب میں

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہوا امید تو ہے انقلاب میں

آنکھ اسکی پھر گئی تھی دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا انقلاب میں

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا نگہ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دل ناکامیاب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اسنے بھیج دیا کیوں جواب میں

تقدیر بھی بری مری تقریر بھی بری
بگڑے وہ پرسش سبب اجتناب میں

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

غزل اگرچہ امیر مینائی کی برابری نہیں کرتی لیکن بری نہیں ہے - اگر حضرت امیر مینائی کی غزل سامنے نہ ہو تو یہی غزل حسن تغزل بن جائے حضرت مومن کے بعد مرزا صاحب نے اپنی غزل پڑھی

غزل مرزا غالب

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

حضرت امیر مینائی نے اٹھ کر مرزا صاحب سے فرمایا - حضرت میری غزل

کی غزل لے لیجیے اور مجھے صرف ایک شعر دے دیجیے۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

مرزا صاحب نے مسکرا کر فرمایا، قبلہ یہ بھی تو آپ ہی کی عنایت کا ثمرہ ہے۔ مدت ہوئی کہ دوستوں میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور حلقۂ احباب میں آپ کی یہی غزل پڑھ کر سنائی۔ فقیر کو غزل پسند آئی، زمین ہموار دیکھ کر دو چار شعر کہہ لیے تھے۔ دوستوں کے اصرار پر کسی دوست نے بغیر میرے مشورہ کے ایک اخبار میں شائع کر دی تھی جو محفوظ رہ گئی۔ ورنہ سنہ ۱۸۵۷ء کی زندگی کسے یاد نہیں)۔ حضرت داغ اور میر تقی میر مشاعرہ سے کہہ کر کسی ضروری کام کیلیے ذرا باہر تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ حضرت غالب مقطع پڑھ رہے تھے کہ وہ تشریف لائے۔ چونکہ ان کے پاس بھی اسی طرح پر غزلیں تھیں لہذا حضرت میر تقی میر نے شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی اور اپنی غزل پڑھی

غزل

آیا کمال مرے دل کی تاب میں — جاتا ہے جی چلا ہی مرا اضطراب میں

دوزخ کیلیے سینہ مرا سوز عشق ہے — اس دل جلے ہوئے کے سبب ہوں عذاب میں

مت کر نگاہ خشم یہی موت ہو چکی — ساقی نہ زہر دے مجھے تو شراب میں

دل کیلیے دو بھی ٹک نہیں دیتے کہیں ٹک گیا — خوبانِ بد معاملہ یوم الحساب میں

جا کر در طبیب پہ بھی میں گرا دلے — ہمزاہ اُن نے کچھ نہ کیا میرے باب میں

بیداد خور حشم نے سب کو کیا ہے میر
ہیں خون خفتہ اُسکے شہیدوں کے خواب میں

غزل پسند فرمائی گئی۔ اُن کے بعد حضرت داغ نے شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی اور اسی طرح میں غزل پڑھی۔

غزل داغ

ان کو کہاں ہے صبر و تحمل عتاب میں — دم بھر کے بعد اور خط آیا جواب میں

کیوں فکر اس قدر ہے رقیبوں کے باب میں
اُنکے گناہ بھی ڈال میرے حساب میں

دیکھا دل ان کا غیر نے سینے پہ رکھ کے ہاتھ
وہ کاش دیکھتے نہ مجھے اضطراب میں

صوفی کو اجتناب ہے واعظ کو احتراز
کیا زہر گھل گیا ہے الٰہی شراب میں

یارب نہ پوچھ عرصۂ محشر میں رازِ دل
کرتا ہوں میں حجاب کی باتیں حجاب میں

عاشق تو کب دبیں گے فرشتوں سے بعدِ مرگ
تکرار نہ ہو جائے سوال و جواب میں

دل دیکے مفت مول لیا پھر ہزار بار
اپنے دھوئیں بکھر گئے عہدِ شباب میں

تر بتر ہوئے ہیں کیسے وہ برسے ہیں کس قدر
لگتی لگاتی بات جو کہدی عتاب میں

آؤ نہ اتنی دیر ہمیں تم کریں کلام
روزِ جزا بھی ہے توقفِ حساب میں

میں دیکھتا ہوں دیکھتے ہی وصل ہجر میں
تعبیر مجھ کو خواب کی ملتی ہے خواب میں

پوچھے جو کوئی حضرت واعظ سے اتنی بات
ایسے ہی تھے جناب بھی عہدِ شباب میں

آنکھ اپنی بند ہوتے ہی پردے سے اُٹھ گئے
دیکھا تھا ہم نے خواب جہانِ خراب میں

تم مجھ پر جور کرکے پشیمان بھی نہیں
میں تم سے دل لگا کے پڑا کس عذاب میں

کچھ ہوش ہو تو داغ کو سمجھائیں نیک و بد
ڈوبا ہوا ہے نشۂ جامِ شراب میں

داغ کا رنگ اور زبان کی چاشنی۔ یہ دونوں نعمتیں صرف داغ ہی کو عطا ہوئی تھیں۔ شعر ہیں کہ روزمرہ کی بول چال۔ محاورے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے چمک رہے ہیں۔ حاضرین دم بخود تھے۔ کسی نے عالمِ بیقراری میں بہت فرمایا تو ماشاء اللہ کہہ کر پھر جھومنے لگے۔ ساری غزل مرصع تھی وہ رنگ جما کہ آپ کے بعد سبھی کا کلام پھیکا رہا۔

اسکے بعد حضرت ظفر اٹھے اور شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی شمع مجلس نے دریافت فرمایا :- آپ کس ردیف میں غزل فرمائیں گے؟

حضرت ظفر نے جواباً ارشاد فرمایا۔ ردیف سین مہملہ میں۔ شمع محلس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "اب حضرت ظفر ردیف سین مہملہ میں اپنی غزل فرمائیں گے۔ سنیئے اور لطف اٹھائیے" انکے بعد جو صاحب اس ردیف میں غزل پڑھنا چاہیں وہ سکریٹری صاحب سے ارشاد فرمادیں" حضرت ظفر سٹیج پر تشریف لائے اور غزل پڑھی۔

غزل

بال ابرو ہیں چشم بت عیار کے پاس
نیلوفر ہے یہ کھلا نرگس بیمار کے پاس

چشم کے گرد ہیں حلقہ مژگاں اس کی
آتے ہیں لوگ عیادت کو یہ بیمار کے پاس

دیکھ اے ابر بہار تو بھی نہ کر ہم چشمی
لعل و گوہر ہیں مرے دیدۂ خونبار کے پاس

مبتلا گل پہ جو بھنورا ہو تو کچھ دور نہیں
دیکھو ہے داغ جگر میرے دل زار کے پاس

منکشف کیوں نہ ہوں آثار محبت تجھ پر
قبر عاشق کی ہے ظالم تیری دیوار کے پاس

حلقۂ زلف پہ اس ابرو کی نہو کیونکر قریب
رکھنی قاتل کو سپر چاہیئے تلوار کے پاس

سوزش عشق میں دل کیوں نہ ہو بیتاب ظفر
جانے دیتا نہیں کوئی مجھے اس یار کے پاس

غزل بحر اور ردیف کی عمدگی کے لحاظ سے بہت پسند فرمائی گئی۔ اسکے بعد شمع محلس نے فرمایا۔ اب جو صاحب اس ردیف میں غزل فرمائیں گے۔ ان کے اسمائے گرامی ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ اب حضرت

میر تقی میر اپنا کلام سنائیں گے۔ انکے بعد حضرت آتش اپنی آتش بیانی سے محفل میں گرمی پیدا کر دیں گے اور پھر مرزا صاحب گوہر نایاب کی ایک لڑی مرحمت فرمائیں گے جسکی روشنی میں دماغوں کو نئی راہیں نظر آئیں گی۔ لیجئے اب حضرت میر تقی میر کا کلام سنئیے اور لطف اٹھائیے۔

غزل

مدت ہجر میں کیا کرتے بیاں یار کے پاس
حال پرسی بھی نہ کی آن کے بیمار کے پاس

در اسیری کا کھلا منہ پہ ہمارے کیا تنگ
مر ہی رہیگا قفس کے در و دیوار کے پاس

داغ ہونا نظر آتا ہے دلوں کا آخر
یہ جو اک خال پڑا ہے تیرے رخسار کے پاس

دل کو یوں لیتے ہو کھٹکا نہیں ہونے پاتا
تربیت پائی ہے تم نے کسی عیار کے پاس

نارسائی بھی نوشتے کی مری دور کھنچی
اتنی مدت میں نہ پہنچا کوئی خط یار کے پاس

دردمندوں سے تمہیں دور پھرا کرتے ہو کچھ
پوچھنے ورنہ سبھی آتے ہیں بیمار کے پاس

اختلاط ایک تمہیں میر ہی غم کش سے نہیں
جب نہ تب یوں تو نظر آئے ہو دو چار کے پاس

میر صاحب کو اس غزل پر خوب داد ملی کیونکہ قافیہ ردیف پر جبر نہیں کیا گیا ہے۔ شعر گوشہ دل سے اٹھتے ہیں اور زبان سے پھول بن کر نکلتے ہیں جن کی بو سے ارباب سخن کے دماغ معطر ہوئے ہیں۔ انکے بعد شمع مجلس نے فرمایا۔ اب حضرت آتش کی آتش بیانی ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت آتش

سٹیج پر تشریف لے گئے اور جیب سے کاغذ نکالا اور غزل پڑھی۔

غزل

ذرۂ خورشید ہو پہونچے جو در یار کے پاس
سایہ بنجاتے ہما اوٹ کے دیوار کے پاس

کار زنجیر جوان گیسوئے پیچاں سے ہوا
روئیں گے بیٹھ کے آزاد گرفتار کے پاس

حالت نزع ہے صورت کوئی بچنے کی نہیں
اٹھ گیا رو کے جو آیا ترے بیمار کے پاس

مجھ کو دربانی کی خدمت ہو تو اے خانۂ یار
سایہ کو آنے نہ دوں میں تیری دیوار کے پاس

پھر گیا منہ میری ابرو کی طرف سے انکا
سینہ کو کھول کے جاتے تھے جو تلوار کے پاس

باغ عالم میں جو رکھا ہی قدم اے آتش
خندہ زن گل کی طرح بیٹھ گئے ہو خار کے پاس

حضرت آتش کے ایک ایک شعر پر واہ وا کے نعرے۔ غزل کا تیسرا شعر شمع محلس اور حضرت مرزا غالب نے کئی بار کہوایا اور مزے لے لیکر سنا۔ حضرت آتش کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ مرزا صاحب جیسے سخن فہموں نے شعر پسند فرمائے ہیں۔ انکے بعد شمع محلس نے مرزا صاحب کے متعلق اعلان فرمایا۔ مرزا صاحب نے بیٹھے بیٹھے اپنی غزل پڑھی۔ سامعین نے نہایت غور سے ایک ایک شعر سُنا۔ داد دی اور وجد کیا۔ پھر دل تھوسے تھے رہے۔ زبان پر واہ واہ تھی۔ اکثر شعروں کو دوبارہ کہوایا اور

غزل

مژدہ اے شوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا میرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تیری دیوار کے پاس

مقطع کے ساتھ ہی مرزا صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سننے والے دل پکڑ کر رہ گئے بعض تو واقعی رو پڑے اور روتے رہے۔ مرزا صاحب نے انداز بدل کر کئی بار مقطع کہا اور ہر بار آنکھوں سے آنسو بہائے۔ شمعِ محفل نے حضرت امیر مینائی سے فرمایا۔ میر صاحب آپ کب تک خاموش رہیں گے! میر صاحب مسکرائے اور وہیں بغیر جواب دیے بیٹھے رہے۔ شمعِ محفل نے پھر فرمایا۔ کیوں میر صاحب آپ اپنے کلام سے مستفید نہ فرمائیں گے؟ میر صاحب نے فرمایا۔ ارشادِ گرامی کی تکمیل میرے لیے باعثِ عزت ہے، تو پھر وہاں کیوں بیٹھے ہیں تشریف لائیے نا

شمعِ مجلس نے ہنس کر فرمایا۔ میر صاحب سٹیج پر تشریف لے گئے اور غزل پڑھی۔

غزل

انسان عزیزِ خاطرِ اہلِ جہاں نہ ہو
وہ مہرباں نہ ہو تو کوئی مہرباں نہ ہو

کلفت کا اپنے نالۂ کشتی میں نشاں نہ ہو
ہم سو برس جو آگ جلائیں دھواں نہ ہو

مشاطہ چاہیے رخِ زیبا کے واسطے
کس کام کا وہ باغ جہاں باغباں نہ ہو

ممکن نہیں کہ زلف سے الجھے نہ اسکی زلف
قرآں کی طرح سے جو وہ رخ درمیاں نہ ہو

کیا داغِ سینہ زیرِ گریباں چھپائیے
خورشید زیرِ دامنِ گردوں نہاں نہ ہو

تارِ نظر سے بڑھ کے ہے لاغر میرا بدن
عشقِ بتاں میں یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

کیونکر ہمارے یوسفِ دل کا پتہ چلے
چاہِ ذقن پہ جب گذرِ کارواں نہ ہو

لکھتا ہوں وصف عارض و ابروئے یار کے
کیوں صفحہ آفتاب قلم کہکشاں نہ ہو

پیری میں بھی کیا نہ تغافل ہزار حیف
اتنا بھی کوئی مائلِ خوابِ گراں نہ ہو

ہے حادثوں سے بعدِ فنا بھی کہاں نجات
ممکن نہیں کہ زیرِ زمیں آسماں نہ ہو

لازم ہے ضبطِ نالۂ دل بعدِ مرگ بھی
ہے لطفِ جام ٹوٹ چکے مئے رواں نہ ہو

ٹوٹیں نہ سنگِ دروں کے اگر شیشہ ہائے دل
دشتِ جنوں میں نام کو ریگِ رواں نہ ہو

آنکھوں سے فائدہ جو نہ دیدار ہو نصیب
حاصل جبیں سے کیا جو تیرا آستاں نہ ہو

جائے اگر کہ چاہِ عدم میں گرائے گا
کوئی سوار توسنِ عمرِ رواں نہ ہو

میر صاحب کی غزل بیحد پسند فرمائی گئی۔ شمع مجلس نے حاضرین سے دریافت فرمایا۔ کیا اور کوئی صاحب اس ردیف میں غزل فرمائیں گے۔ حضرت مومن اٹھے اور فرمایا۔ اجازت ہو تو غزل پیش کروں! شمع مجلس نے مسکرا کر فرمایا۔ تشریف لائیے ہم تو مدت سے منتظر ہیں۔ حضرت مومن سٹیج پر تشریف لائے۔

غزل

خالی ہوائے فتنہ سے گاہے جہاں نہو
اس دم قیامت آئے اگر آسماں نہو

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اسکے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہو

یوں تو بہت سے دل کے خریدار ہیں ولے
جو ہے سو بد معاملہ کیونکر زیاں نہو

لکھتا ہوں اس کو تشنگیٔ دل کا ماجرا،
آنسو رواں نہو تو سیاہی رواں نہو

شیخِ حرم سے کام نہ پیرِ مغاں سے ربط
کیا کفر و دیں جو پاس وہ زیبا جواں نہو

تر کر دیا ہے ابرِ بہاری نے اسقدر
بجلی گرے تو گرم میرا آشیاں نہو

اب شوق وصل ہے نہ غم صبر مدعی
پامال ہو چکا ہوں عبث سرگراں نہو

کرنی نہ تھیں بگاڑ کی باتیں گلہ میں ہائے
کیسی بنے جو دل سے وہ نامہرباں نہو

عزم سفر جہاں سے کروں کیا شبِ فراق
میں جانتا ہوں جئیں کہاں تک جہاں نہو

اس شرط پر جو لیجئے تو حاضر ہے دل ابھی
رنجش نہو فریب نہو امتحاں نہو

یہ جامہ پارہ پارہ تڑپنے سے ہو گیا
صبح شب فراق ہے تو بدگماں نہو

مومن بہشت و عشق حقیقی تمہیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غم جاوداں نہو

ان کے اشعار میں ہر ایک نے اپنا غم تصور کیا ہر ایک کا دل تڑپا اور آنکھوں نے آنسو بہائے۔ انکے بعد حضرت داغ تشریف لائے اور اسی زمین میں غزل پڑھی۔

غزل

پوشیدہ جب ہو راز کہ منہ میں زباں نہو
ہم بات بھی کریں تو بغیر از فغاں نہو

رکھنا ہماری خاک سے کچھ راہ اے صبا
مرقد میں بند سوزِ جگر کا دھواں نہو

مارا نگاہ ناز سے پہلے جگر پہ تیر
پھر اس پہ حکم یہ ہے کہ لب پر فغاں نہو

تم کو مزا نہ دیگی کبھی داستان عشق
جب تک ہمارے منہ سے یہ قصہ بیاں نہو

کہتے ہیں لوگ زیر زمیں جس کو آسماں
وہ کشتگانِ آتشِ غم کا دھواں نہو

رکھتے ہیں کیا چھپا کے غم یار دل میں ہم
ڈر ہے کہ یہ نصیب دلِ دشمناں نہو

تہمت کسی کو ظلم کی اے داغ کیوں بھلا
شکوہ بتوں سے کیا جو خدا مہرباں نہو

حضرت داغ کی غزل کو مرزا صاحب نے خاص طور پر سراہا۔ واہ وا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تالیوں کا شور اٹھا۔ حضرت داغ اٹھ ہی رہے تھے کہ مرزا صاحب نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور فرمایا۔ حضرت! ایک چلو سے کیا بنتا ہے۔ حضرت داغ ہنس پڑے اور فرمایا۔ یہی داغ ہمارے دل میں ہے۔ یہ ایک طعن تھا جسے سنکر مرزا صاحب کی بے اختیار

ہنسی چھوٹ گئی۔ حضرت داغؔ نے مسکراتے ہوئے جیب میں سے کاغذ نکالا اور دوسری غزل سنائی۔ غزل کے شعروں نے نشتروں کا کام کیا حضرت داغؔ کی یہ غزل بہت زیادہ پسند فرمائی گئی۔ داغؔ کی زبان کی خوبیاں اور طرزِ ادا کی شوخیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ جس غزل میں ایسے شعر ہوں۔ سہ

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

وہ غزل کیوں پسند نہ فرمائی جائے۔ ہر شعر میں شوخی اور شگفتگی کی نمایاں جھلک ہے ملاحظہ ہو۔

غزل

آرزو ہے وفا کرے کوئی — جی نہ چاہے تو کیا کرے کوئی
گر مرض ہو دوا کرے کوئی — مرنے والے کا کیا کرے کوئی
کوستے ہیں جلے ہوئے کیا کیا — اپنے حق میں دعا کرے کوئی
اُن سے سب اپنی اپنی کہتے ہیں — میرا مطلب ادا کرے کوئی
چاہ سے آپ کو تو نفرت ہے — مجھ کو چاہے خدا کرے کوئی
اُس گلے کو گلہ نہیں کہتے — گر مزے کا گلہ کرے کوئی
یہ ملی داد رنجِ فرقت کی — اور دل کا کہا کرے کوئی
تم سراپا ہو صورتِ تصویر — تم سے پھر بات کیا کرے کوئی

کہتے ہیں ہم نہیں خدائے کریم — کیوں ہماری خطا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں — ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
اس جفا پر تمھیں تمنا ہے — کہ میری التجا کرے کوئی

منہ لگاتے ہی داغ اترائے
لطف ہے پھر جفا کرے کوئی

غزل بہت پسند فرمائی گئی خواب واہ واہ ہوئی خوب ہی داد ملی حضرت داغ نے مرزا صاحب سے فرمایا - قبلہ کچھ آپ بھی تو فرمائیں - حاضرین میں سے ایک نوجوان بانکا اٹھا اور بولا قبلہ مرزا صاحب اس زمین میں آپ نے بھی تو ایک غزل کہی ہے - حضرت داغ نے مرزا صاحب کو مسکرا کر دیکھا - مرزا صاحب نے فرمایا اچھا بھئی سن لو - مرزا صاحب نے اپنے ایک شاگرد سے غزل طلب فرمائی اور محفل میں پڑھی -

غزل

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کماں کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کہے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

مرزا صاحب کی غزل پر محفل نے وجد کیا۔ واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ لوگ سر دھنتے رہے۔ جھومتے رہے۔ حضرت داغؔ نے مرزا صاحب سے فرمایا: "ہم اتنے کور ذوق نہیں ہیں کہ شبنم کے قطروں سے مطمئن ہو جائیں" حاضرین نے تالیوں کے شور وغل سے تائید فرمائی۔ مرزا صاحب نے سامعین کے اصرار پر دوسری غزل پڑھی۔

غزل

کیوں جل گیا نہ تاب رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکھتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اسکے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موج مے تیری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ دے رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تیری دیوار دیکھ کر

شعر کیا تھے سلگتی ہوئی چنگاریاں تھیں مرزا صاحب شعر پڑھ رہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ محفل میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غزل کے خاتمہ پہ ہلکی ہلکی آہیں اُٹھیں اور آہوں کے بعد واہ وا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ مقطع پر تو خود مرزا صاحب کا بھی جی بھر آیا اور آنسو ٹپک پڑے۔ مرزا صاحب کے بعد حضرت میر تقی میرؔ نے اسی زمین میں غزل پڑھی

غزل

مرتے ہیں تیرے نرگسِ بیمار دیکھ کر جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے پھر مر گئے تیرے تئیں اک بار دیکھ کر

ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو قاصد تو کہیو ٹک کہ جفا کار دیکھ کر

کوئی جو دم رہا ہے سو آنکھوں میں ہے بھر آب کر یو ٹک ایک وعدۂ دیدار دیکھ کر

[illegible] جلوہ [illegible] چشم ہے — جو اِدھر دیکھے وہیں پیار سے سو بار دیکھ کر
[illegible] آسماں ہے [illegible] — [illegible] در و دیوار دیکھ کر
[illegible] نہیں ہی ہے — رکھ دیا قدم زمیں پہ ستمگار دیکھ کر
[illegible] بیٹھ گیا [illegible] — پچھتا رہے ہیں مجھ کو وہ بیمار دیکھ کر

[illegible] ہے تو کیا [illegible]
پر جب [illegible] دیکھ کر

مرزا صاحب کے بعد غزل سنانا کوئی مذاق نہیں ہے، وہی جرأت کر سکتا ہے جسے اپنے اوپر پورا اعتماد ہو۔ میر صاحب کی غزل سننے سے پہلے لوگوں نے [illegible] ذوق کی جس غزل [illegible] کہ بے اختیار واہ وا کے نعرے بلند ہوئے۔ غزل ختم کرنے کے بعد میر صاحب نے حضرت غالب سے اشارہ فرمایا کہ وہ اپنی غزل

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

اس شعر کو میں سنتا ہوں۔ حاضرین نے تالیوں کے شور و غل سے تائید فرمائی۔ مرزا صاحب نے بہ اصرار سامعین غزل سنائی

غزل

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ بات کہتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

مقطع پر خوب قہقہے اُڑے۔ آپ کے بعد میر درد کے بھائی حضرت اثر نے اسی زمین میں غزل پڑھی۔ جس کی تعریف خود مرزا غالب نے فرمائی

غزل

تو میری جان گر نہیں آتی — زیست ہوتی نظر نہیں آتی
دلربائی و دلبری تجھ کو — گو کہ آتی ہے پر نہیں آتی
حالِ دل مثلِ شمع روشن ہے — گو مجھے بات کر نہیں آتی
ہر دم آتی ہے گرچہ آہ پر آہ — پر کوئی کارگر نہیں آتی
کیا کہوں آہ میں کسو کے حضور — نیند کس بات پر نہیں آتی

نہیں معلوم دل پہ کیا گذری ان دنوں کچھ خبر نہیں آتی
کیجیئے نا مہربانی ہی آکر مہربانی اگر نہیں آتی
دن کٹا جس طرح کٹا لیکن رات کٹتی نظر نہیں آتی
ظاہرا کچھ سوائے مہر و وفا
بات تجھ کو اثر نہیں آتی

اس کے بعد حضرت ذوقؔ اٹھے اور شمع مجلس سے حسب دستور اجازت طلب فرمائی۔ سٹیج پر آئے اور غزل پڑھی جس کی زمین تھی۔ زباں کے لیئے ۔ نہاں کے لیئے ۔ غزل کے ایک ایک شعر پر تالیوں کا شور اٹھا۔ واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ امیر خسروؔ ۔ حضرت ولیؔ اور مرزا صاحب نے غزل کو پسند فرمایا۔ کئی شعر دوبارہ کہوائے اور مزے لے لے کر سنے۔ لوگ سر دھنتے اور واہ واکیے تھے لیجیئے وہ غزل ملاحظہ فرمایئے۔

غزل

مزے یہ دل کیلئے تھے نہ تھے زباں کیلئے سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے
نہیں ثبات بلندی عز و شاں کیلئے کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے
ہزار لطف میں جو ہم ستم ہیں جاں کیلئے ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے
فروغ عشق ہے روشنی یہاں کیلئے یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے
صبا جو آئے خس و خار خاکداں کیلئے قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے

سدا تپش پہ تپش ہے دلِ تپاں کیلئے
ہمیشہ غم پہ ہی غم جانِ ناتواں کیلئے

حجر کے چومنے ہی سے ہے حج کعبہ اگر
تو بوسے ہمنے بھی اس سنگِ آستاں کیلئے

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

جو پاسِ مہر و محبت کہیں یہاں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کیلئے

خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن تنِ زار
ہمیشہ اس ترے مجنونِ ناتواں کیلئے

مرے مزار پہ کس طرح سے نہ برسے نور
کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کیلئے

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ ساماں
اثاثہ چاہیئے کیا خانۂ کماں کیلئے

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خوں فشاں کیلئے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

حضرت ذوق کے بعد حضرت مومن اٹھے اور فرمایا۔ اگر اجازت مرحمت فرمائی جائے تو بندہ بھی اس زمین میں اپنی غزل پیش کرے۔ شمع مجلس نے مسکرا کر فرمایا۔ مومنوں کے لیے ہر مقام پر جگہ ہے۔ سر آنکھوں پر تشریف لائیے۔ کہئے تو آپ کو دل میں بٹھالوں۔ اس فقرہ سے مجلس میں خوب قہقہے اڑے۔ لوگ دیر تک ہنستے رہے۔ حضرت مومن مسکراتے ہوئے سٹیج پر پہنچے اور ترنم کے ساتھ اپنی غزل پڑھی۔ ترنم نے ایک جادو کا اثر کیا۔ لوگ وجد کر رہے تھے۔ مرزا صاحب بھی سر جھکائے غزل سن رہے

تھے۔ کسی کسی شعر پر پھڑک اٹھتے تھے تو بہت خوب کہتے اور پھر ہمہ تن گوش ہو کر شعر سنتے۔

غزل

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیئے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیئے

نہ چاہیئے یار کے بوسے نہ آستاں کے لیئے
عبث ہیں خاک ہوا میں آسماں کے لیئے

خلافِ وعدہ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امید یک شبہ ہو یاس جاوداں کے لیے

نہیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
کہ سخت چاہیئے دل بھی رازداں کے لیے

حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب
فغاں اثر کے لیے اور اثر فغاں کے لیے

ہے اعتماد میرے بخت خفتہ کو کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے

مزہ یہ شکوہ میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ
ہیں تلخ کام رہا لذتِ زباں کے لیے

لیا ہے دل کے عوض جان دے رقیب تو دوں
میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لیے

وہ لعل روح فزا دے کہاں تلک بوسے
کہ جو ہے کم ہے میلِ شوقِ جانفشاں کے لیے

ملے رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لیے

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیم برق ہمارے آشیاں کے لیے

جنونِ عشق ازل کیوں نہ خاک اڑائیں کہ ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانیِ جہاں کے لیے

بھلا ہوا کہ ستم آزما ستم سے ہٹے
ہمیں بھی دینی تھی جان اسکو امتحاں کے لیے

رواں فزا ہے سحر حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لیے

حضرت مومن کے بعد مرزا غالب نے اصرار شمع مجلس اسی زمین میں اپنی غزل فرمائی۔ غزل کے شعر کیا تھے شعلے تھے۔ مرزا صاحب اپنے مخصوص انداز میں یہ غزل پڑھی۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ واردات ہے۔ وہ غزل یہ ہے :-

غزل

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کیلئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژہ یار تشنہ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جسکے آستاں کے لیے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

مقطع کا نشتر ہر ایک کے دل میں چبھ گیا۔ حضرت ظفر نے استاد ذوق سے فرمایا۔ قبلہ وہ غزل پڑھیے جس کی زمین ہے۔ خواب تو دے۔ حضرت ذوق نے کچھ پوچھا اور پھر اٹھ کر صاحبِ صدر سے اجازت طلب فرمائی۔ سٹیج پر گئے اور غزل پڑھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمین میں کوئی دوسرا غزل نہ کہہ سکے گا۔ لیکن جب ان کے بعد حضرت غالب نے اپنی غزل پڑھی تو آفتاب کے چمکتے ہی ستارے مدھم پڑ گئے۔ پہلے حضرت ذوق کی غزل ملاحظہ فرمائیے اور پھر مرزا صاحب کی غزل۔

غزل

کہاں تلک کہوں ساقی لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

بجھے گا سوزِ دل اے گریہ پہلے آب تو دے
دگر ہے آگ ہیں دنیا یونہیں عذاب تو دے

گذر کے گریہ میرے سر سے اتنا آب تو دے
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلاتی جوں حباب تو دے

کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچہ نرگس
ذرا دکھا اسے تو چشمِ نیم خواب تو دے

بلا سے آپ نہ آئیں پہ آدمی ان کا
تسلی آکے مجھے وقتِ اضطراب تو دے

صبا بگولا ہے اس اسیرِ زلف کی خاک
کہ بعد مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

بلا سے کم ہو گریہ سے میرا سوزِ جگر
بجھا کچھ ان کی ذرا آتش عتاب تو دے

شکار بستۂ فتراک کو تیرے مقدور
ہوا نہ یہ بھی کہ بوسہ سرِ رکاب تو دے

نشے میں ہوش کے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہیں بوسے بلا حساب تو دے

جواب نامہ نہیں گر تو رکھدے نامہ یار
جو پوچھیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے

رکھے ہے حوصلہ دریا کب اہلِ ہمت کا
نہیں یہ اتنا کہ بھر کاسۂ حباب تو دے

خنک دلوں کی اگر سنتِ خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی اکبار آگ داب تو دے

پہنچ رہوں گا سرِ منزلِ فنا اے ذوق
مثالِ نقشِ قدم کوئے پا تراب تو دے

حامیانِ ذوق نے وہ شور برپا کیا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دی۔ تالیاں بجائیں۔ واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ حضرت ذوق پھولے نہ سمائے جب مرزا صاحب نے یہ رنگ دیکھا تو اٹھ کر شمع محفل سے اجازت طلب فرمائی اور کاغذ نکال کر میز پر رکھ لیا۔

اب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ تماشہ دیکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم ہوا۔ مرزا صاحب یہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش نہ رہ سکے کیونکہ ذوق کے بعد آپ کا خاموش بیٹھا رہنا باعثِ ذلت تھا اور وہ اس ذلت کو کیونکر گوارا فرما سکتے تھے۔ چنانچہ اپنے مخصوص رنگ میں اسی وقت غزل کہی اور اپنے ایک شاگرد سے پڑھوائی۔ اس نوجوان کو اللہ نے وہ گلا عطا فرمایا تھا کہ سننے والے بیہوش ہو جاتے۔ چنانچہ مرزا صاحب کے فرمانے

اس پر مٹیھی سر یں محفل میں آگ ہی لگا دی - وہ غزل ملاحظہ فرمایئے -

غزل

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگاہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کوئی جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ان کے بعد خواجہ میر درد نے بہ اجازت صاحبِ صدر ایک غزل پڑھی جس کی زمین ہے - تدبیر سے - زنجیر سے - غزل بہت پسند فرمائی گئی - کہنے کو تو صرف پانچ شعر تھے لیکن صاحبِ ذوق نے انہیں پانچ نشتر گنا ہے - میر صاحب بالعموم چھوٹی بحر میں پانچ سات شعر کی غزل کہا کرتے -

غزل

کب ترا دیوانہ آوے قید میں تدبیر سے
جوں صدا نکلا ہی جائے خانۂ زنجیر سے

قدر مردِ فن کی سمجھے کے نہیں یہ نا بکار
جوہری واقف نہووے جوہرِ شمشیر سے

دیکھنا تو آ کے از خود رفتگاں کا حال ٹک
جا بجا سب پشت بر دیوار ہیں تصویر سے

منعم ایسے قصر لاکھوں مل گئے ہیں خاک میں — جز خرابی کے بتا کیا فائدہ تعمیر سے

درد اب ہنستے ہیں رونے پر مرے سب خاص و عام
کیا ہوئے وہ نالے جو لگتے تھے دل میں تیر سے

خواجہ صاحب کے بعد حضرت امیر مینائی نے اس زمین میں غزل فرمائی
غزل کا ہر شعر گوہرِ نایاب ہے۔

غزل

توڑ کر پہلو جو دل نکلا دلِ نخچیر سے — خوب روئیں حسرتیں پیکاں کی لپٹ کر تیر سے
بیخود ایسا ہوں کسی کی لذتِ تقریر سے — پہروں کرتا ہوں خموشی کا گلہ تصویر سے
اے گلِ تر تیرے جذبِ حسن کی تاثیر سے — رنگ خوں ہو کر ٹپکتا ہے میری تصویر سے
کیا لبِ معشوق ہو کر جان لی نخچیر سے — سیکھ لے گھر دل میں کرنا کوئی اسکے تیر سے
داغِ سینہ داغِ پہلو زخمِ دل دردِ جگر — کیسے کیسے ہمنشیں مجھ کو ملے تقدیر سے
آ کے بربادی ہمارے خانۂ دل میں بسی — گھر خرابی کا ہوا آباد اس تعمیر سے
بیڑیاں دیوانۂ گیسو کو پہناتے ہو کیوں — رشتۂ الفت کا یہ پھندا سخت ہے زنجیر سے
اتنی آرائش بھی انکو ہے نزاکت سے گراں — کم نہیں پھولوں کا بدھی آہنی زنجیر سے
دھوم ہے قاتل تیری آئی ہیں پریاں سیکھنے — چال تیری تیغ سے پرواز تیرے تیر سے
تیر نکلا بھی نہیں قاتل کے ترکش سے ابھی — روح خوش ہو کر نکل آئی تنِ نخچیر سے
زخم یہ اچھے نہیں کھائے ہیں تو صدقے امیر — لیکے آیا ہے وہ اس تیغ خطِ شمشیر سے

غزل کا پانچواں نواں اور دسواں شعر تین تین بار کہوایا گیا۔ لوگوں نے جھوم جھوم کر شعر سنتے اور مزے لے لے کر دہراتے۔ جب مرزا صاحب اور حضرت ذوق نے داد دی تو امیر صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان کے بعد حضرت مومن نے شمع محفل سے اجازت طلب فرمائی اور اس زمین میں غزل پڑھی۔ حضرت مومن کی یہ غزل بہت پسند فرمائی گئی۔ خوب داد ملی۔ تالیوں کا شور اٹھا۔ واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ غزل ملاحظہ فرمائیے۔

غزل مومن

ہے فسانہ ساتھ سونے کب کسی تدبیر سے ۔۔۔ نیند آتی ہے ہمارے خواب کی تعبیر سے

ہائے پھر مرنے لگا میں لطف کی تقریر سے ۔۔۔ اس کا دم بھی کم نہ تھا ہرگز دمِ شمشیر سے

بزمِ دشمن سے نہ اٹھے وہ کسی تدبیر سے ۔۔۔ مل گئے ہم خاک میں محشر تیری تاخیر سے

میرے لکھے کو مٹایا آپ نے اچھا ہوا ۔۔۔ تھا شگوں ہی مدعا یاں نامہ کی تحریر سے

جائے شربت مرتے دم بھی خون پلایا ہائے ہائے ۔۔۔ منہ مرا کھولا ستم پیشہ نے نوکِ تیر سے

ایسے نازک کے شمائل کیوں نہ دل میں نقش ہوں ۔۔۔ کھنچ گیا سینہ پہ نقشہ غیر کی تصویر سے

کب لگا لے کاسہ گر اس لب سے جام اس خاک کا ۔۔۔ کام ہونے کا نہیں پھر فائدہ تدبیر سے

کاٹتا ہوں عرضِ سوزش میں زباں کو دمبدم ۔۔۔ میرے دندانِ ندامت کم نہیں گل گیر سے

اے جنوں اپنی اسیری بعد مردن بھی رہی ۔۔۔ حلقۂ ماتم میں آئے حلقۂ زنجیر سے

کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھیگا کوئی ۔۔۔ ان کو بیتابی ہے کیوں اس خواب بے تعبیر سے

تم سے وہ کرتا ہے باتیں شک نہ دو تا ہوں میں یا ۔۔۔ سچ کہا جھڑتے ہیں موتی غیر کی تقریر سے

نالہ ہائے بوالہوس نے کھو دیا آزارِ شوق ۔۔۔ لو ہم اچھے ہو گئے درمانِ بے تاثیر سے
ساتھ سونا غیر کے چھوڑا تو اے سیمیں بدن ۔۔۔ خاک میری ہو گئی نایاب تر اکسیر سے
عشق اس قاتل کا بعدِ قتل بھی ہم کو رہا ۔۔۔ ہے یہ کیسا جرم جو جاتا نہیں تقدیر سے
سر پٹکتا ہے قلق میں مومنِ خانہ خراب
مسجدیں رہنی نہیں کیا فائدہ تعمیر سے

حضرت میر درد نے اٹھ کر شمع محفل کی خدمت میں کہا۔ فقیر غزل پیش کرنا چاہتا ہے۔ شمع محفل نے فرمایا۔ کس زمین میں غزل فرمائیں گے آپ! درد صاحب نے فرمایا۔ زمینِ بتاں ہنوز۔ آسماں ہنوز ہے۔ شمع محفل نے مسکرا کر فرمایا۔ ع

دل سے گیا نہیں خیالِ بتاں ہنوز

مصرع کے ساتھ ہی محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔ تالیوں کا شور ہوا۔ درد صاحب مسکراتے ہوئے سٹیج کی طرف بڑھے۔ انکی غزل کا مقطع کچھ اور تھا۔ سٹیج تک پہنچتے پہنچتے مقطع میں اسی مصرع کو باندھ لیا۔ ساری غزل مسکراتے ہوئے پڑھی۔ کچھ ایسا رنگ جما کہ محفل جھوم اٹھی۔ ہر شعر پر داد ملی اور واہ وا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ درد صاحب کی غزل ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

لیتا نہیں کبھو دے اپنی عناں ہنوز ۔۔۔ پھرتا ہے کس تلاش میں یہ آسماں ہنوز

ہے بعد مرگ بھی وہی آہ و فغاں ہنوز
لگتی نہیں ہے تالو سے میری زباں ہنوز

موجود بوجھتا نہیں کوئی کسو کے تئیں
توحید تو بھی ہوتی نہیں ہے عیاں ہنوز

سو سو طرح کی ہجر میں ہوتی ہے جانکنی
مرتا نہیں ہوں تو بھی تو میں سخت جاں ہنوز

ہر چند کہنہ سال ہے دنیا تو کس قدر
آتی ہے پر نظر میں سبھوں کی جواں ہنوز

کعبہ میں ورد آپ کو لایا ہوں کھینچ کر
دل سے گیا نہیں ہے خیالِ بتاں ہنوز

ان کے بعد حضرت مومن تشریف لائے اور اسی زمین میں اپنی ایک انی غزل پڑھی بعض لوگوں کی یہ غزل پہلے بھی سنی ہوئی تھی اور جن لوگوں نے پہلی مرتبہ سنی انھیں جی سے پسند آئی۔ حضرت غالب سے بعض شعروں پر داد ملی اور مومن نے اٹھ کر سلام کیا۔ لوگوں نے مرزا صاحب کی تائید میں تالیاں بجائیں غزل ملاحظہ ہو۔

غزل

ہے چشم بند تو بھی ہیں آنسو رواں ہنوز
جی سرد ہو گیا ہے و لے دل طپاں ہنوز

یہ دن دکھائے ہیں شبِ فرقت نے ہمکو اور
وہ رشکِ آفتاب نہیں مہرباں ہنوز

مر بھی گئے جدائی میں پردہ نشین کے پر
آیا نہیں زبان پہ دردِ نہاں ہنوز

ہم تیرہ بخت خاک میں بھی مل گئے و لے
کچھ کم نہیں غبارِ دلِ آسماں ہنوز

یاں امتحانِ مرگ سے فارغ ہوئے ہیں یاں
واں اپنے ہی پہ مرنے کا ہے امتحاں ہنوز

تشبیہ دی تھی میں نے کہیں انگبین سے
تبخالہ خیز ہے لبِ شیریں دہاں ہنوز

روزِ جزا نہ قتل کا انکار کر کہ ہیں،
دامن پہ تیرے ہیں مرے لہو کے نشاں ہنوز

یاں اپنا ان کی راہ میں مرنا یقیں ہوا
واں اور ہی کے چاہنے کا ہے گماں ہنوز

مومن تو مدتوں سے ہوئے پر بقولِ درد
دل سے نہیں گیا ہے خیالِ بتاں ہنوز

مقطع پر بے اختیار اہا ہا ہا۔ نکل گیا۔ لوگوں نے ایک شور اٹھایا۔ واہ وا کا شور۔ ایک غل اٹھا۔ آہا ہا ہا کا غل۔ مرزا صاحب نے چھ مرتبہ مقطع کہوایا اور جھوم جھوم کر سنا۔ شمع مجلس بہت خوش ہوئے۔ حضرت درد اٹھے اور فرمایا جی چاہتا ہے کہ اپنی غزل کا مقطع بدل دوں۔ حضرت مومن نے فرمایا۔ پھر غزل میں کیا رہے گا۔ اور میری غزل کو مزے لے لے کر کون پڑھے گا۔ درد صاحب ہنس پڑے۔ ان کے بعد حضرت میر تقی میر تشریف لائے اور اسی زمین میں غزل فرمائی۔ لوگوں نے بصد اشتیاق شعر سنے۔ اکثر شعر مرزا صاحب نے پسند فرمائے اور دوبارہ کہوائے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

غزل

ہے زیرِ خاک لاشۂ عاشق طپاں ہنوز
پیدا ہے عشق کشتے کا اسکے نشاں ہنوز

گردش سے اسکی خاک برابر ہوئی ہے خلق
استادہ روئے خاک پہ ہے آسماں ہنوز

اس تک پہنچیے گا نہیں ہے حال کچھ مرے
جاتے ہیں گرتے پڑتے بھی ہم ناتواں ہنوز

پروانہ جل کے خاک ہوا پھر اڑا کیا
اے شمع تیری رہتی نہیں ہے زباں ہنوز

چندیں ہزار جانیں گئیں اسکی راہ میں
ایک آدھ تو بھی مر رہے ہے نیم جاں ہنوز

مدت ہوئی کہ خوار ہو گلیوں میں مر گئے
قصہ ہمارے عشق کا ہے داستاں ہنوز

لختِ جگر کے غم میں کہ تھا لعل پارہ میر
رخسار زرد پہ ہے مرے خوں رواں ہنوز

چھٹے شعر پر ایک صاحب نے اٹھ کر کہا۔ حضرت اس شعر میں وہی مصرع لگاتے تو خوب رہتا۔

مدت ہوئی کہ خوار ہو گلیوں میں مر گئے
دل سے نہیں گیا ہے خیالِ بتاں ہنوز

خوب تالیوں کا شور اٹھا۔ شمع محلس نے فرمایا میر صاحب شعر تو واقعی خوب ہو گیا ہے۔ مقطع یہی رکھ لیجئے۔ میر صاحب نے فرمایا۔ قبلہ یہ شعر نہیں پیشگوئی ہے اور واردات بھی۔ شمع محلس اپنے فہم پہ کچھ نادم ہوئے اور فرمایا۔ ہاں قبلہ اشعر آپ ہی کا بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ یہ کج نگاہی ہے کہ آپ کے مصرع کو بدلا جائے۔ سامعین نے پھر تالیوں کے شور سے داد دی۔ ان کے بعد حضرت ظفر اور مرزا غالب نے اپنی غزلیں سنائیں۔ جس کی زمین تھی نشاں اور جہاں اور۔ غزلیں ملاحظہ فرمایئے۔

غزل

دن اور ہے رات اور زمیں اور زماں اور
رہتے ہیں زخود رفتہ جہاں ہو وہ جہاں اور

اک بار کئے نذر دل و جاں تیرے دونوں
اب کیا تجھے دیں ہم کہ نہ دل اور نہ جاں اور

دے جام پہ گر جام پیالے مجھے ساقی
میں بس نہ کہوں منہ سے کہے جاؤں کہ ہاں اور

جل جائیگی اے برق نہ ہو دیکھ مقابل
ہے سوختہ جانوں کا دم شعلہ فشاں اور

کچھ چشم تر و سوزِ جگر پر نہیں موقوف
افشائے محبت کے بہت سے ہیں نشاں اور

کس طرح غم یار کو میں دل سے نکالوں
جائے یہ کہاں اس کا ٹھکانہ ہے کہاں اور

کیا ہوویگا اک چاک کو سینہ کے رفو سے
دل میں تو ہزاروں ہیں ابھی زخم نہاں اور

دوں دل میں جگہ کیوں نہ میں اس پردہ نشیں کو
اس سے نہیں بہتر کوئی پردہ کا مکاں اور

محفل سے اٹھا غیر کو اور اس کے عوض تو
رکھدے میری چھاتی پہ کوئی سنگ گراں اور

یہ شوقِ شہادت کی ہے تاثیر کہ قاتل
ہوتی ہے میرے خوں سے تیری تیغ رواں اور

تو گھر کو سدھار اپنے خدا کے لیے ناصح
ہوتا ہے تیری باتوں سے مجھ کو خفقاں اور

مینہ خوب برستا ہے جو ہوتی ہے ہوا بند
بہتے ہیں ظفر اشک دم ضبطِ فغاں اور

غزل

ہے بسکہ ہر اک انکے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھینگے
لے آئینگے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاّد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

دیتا نہ اگر دل تمہیں لیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مرزا صاحب کے بعد حضرت ظفرؔ نے غزل پڑھی ۔ کہو تو کیونکر ہو۔ حضرت ظفر کے بعد قبلہ مرزا صاحب نے بھی اس زمین میں غزل پڑھی۔ کہو تو کیونکر ہو۔ سامعین نے دونوں بزرگوں کی غزلوں کو پسند فرمایا۔ لیکن مرزا صاحب کی غزل زیادہ پسند فرمائی گئی لیجئے وہ غزلیں ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

نصیب وصل تمہارا کہو تو کیونکر ہو
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

تو اپنے وعدہ کا سچا جو ہو تو کیونکر ہو
یہ تجھ سے جھوٹ کی ہو ترک خو تو کیونکر ہو

نہ جل کے خاک ہو جب تک کہ مثلِ پروانہ
ہو طپش دل کا ہمارے فرو تو کیونکر ہو

تیرے مریض کے گر سو علاج ہوں لیکن
شفا نہ اس کے نصیبوں میں ہو تو کیونکر ہو

کسی پہ راز نہاں دل کا تیرے اے آنکھو
جو تم نہ گریہ سے افشا کرو تو کیونکر ہو

یہ ہم بھی چاہتے ہیں ترکِ عشق ہو لیکن
جو دل پہ بس نہ ہو اے ناصحو تو کیونکر ہو

ملیں نہ خاک میں جب تک تمہارے کشتۂ ناز
دمیدہ خاک سے ہو نازبو تو کیونکر ہو

جگر پہ زخم تو کھائے مگر مزہ حاصل
نمک فشاں نہ ہو وہ جنگجو تو کیونکر ہو

کرم کہاں کہ ستم بھی ہو کرتے ناز سے تم
جو یہ بھی ہو تو غنیمت ہے نہ تو کیونکر ہو

ظفر جو ہو نہ محبت میں دل سے دل کو راہ
وہ میرے حال سے آگاہ ہو تو کیونکر ہو

غزل

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
اگر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمہیں کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور

فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

حضرت ذوق اٹھے اور شمع مجلس سے فرمایا۔ اجازت فرمائیں تو ایک غزل ۔ہجر یار سے عرض کروں ۔ شمع مجلس نے ہنس کر فرمایا۔ حضرت قافیہ تو خوب بولتا ہے ۔ تشریف لائیے اور فرمائیے ۔حضرت ذوق سٹیج پر تشریف لے گئے اور اپنی مطبوعہ غزل پڑھی ۔غزل کے دس مقطع اور چار شعر تھے ۔

غزل

ہے ترے رشک خط رخسار سے دل میں آئینہ کے جوہر خار سے

شرح فرط حسرت دیدار سے جو نگاہ ہے کم نہیں طومار سے

کھائے داغ آتش رخسار سے کم نہیں دل مرغ آتش خوار سے

ہاتھ اٹھاؤ عشق کے بیمار سے کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

اُنس ہے کیا دل میں تیر یار سے ہے مشابہ زخم بھی تلوار سے

یوں نگہ نکلے ہے چشم یار سے مست جیسے خانۂ خمار سے

میرے طرز نالہ ہائے زار سے ٹپکے بلبل کے لہو منقار سے

فرشِ گل پر مجھ کو ہجرِ یار سے — کم نہیں یارِ رگِ گل خار سے
آئینہ اس شعلہ رخسار سے — گرم ہے دوکانِ آتش کار سے
بے نصیب اسکے ہیں گر دیدار سے — سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے
خنجرِ موجِ تبسم سے تیرے — گل چمن میں ہیں جگر افگار سے
اٹھ چکا وہ ناتواں جو رہ گیا — دب کے تیرے سایۂ دیوار سے
صاف اک ابرِ شفق آلود ہے — زلف اس کی سرخیٔ رخسار سے

بے تمیزوں کو ہو نقصانِ لطفِ ذوق
لیس ہیں نام طفلِ آدھا پیار سے

ان کے بعد حضرت امیر مینائی تشریف لائے اور اسی زمین میں غزل پڑھی ”آنکھ مجھ سے دل ہے اغیار سے“ غزل کا ہر مصرع ہر شعر دلوں کو تڑپا گیا۔ جب امیر صاحب نے یہ شعر پڑھا ؎

کر چکے قتل اب کہیں رسوا نہ ہو
جاؤ دھو ڈالو لہو تلوار سے

تو مرزا صاحب تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بے ساختہ بولے۔ حضرت پھر فرمائیے۔ چنانچہ سہ بارہ سنا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور فرمایا۔ کوئی میرا سارا دیوان لے لے اور یہ شعر مجھے دیدے۔ حضرت امیر نے فرمایا قبلہ عالم فقیر تو غلام ہی آپ کا ہے۔ شعر پسند فرمایا مجھے دو جہان کی دولت مل گئی۔ حضرت مرزا صاحب جس شعر کو پسند فرمائیں اس پہ ہزار فخر کیا جائے

توکم ہے لیجئے وہ غزل ملاحظہ ہو اور مزے لے لے کر پڑھیئے۔

غزل

آنکھ مجھ سے مل ملے اغیار سے
یار در گذرا میں ایسے پیار سے

ہے حسینوں کو خلش مجھ زار سے
پھول کچھ کھٹکے ہوئے ہیں خار سے

کیجئے قتل ابروئے خمدار سے
کاٹئے جو رنگ اس تلوار سے

مر کے چھوٹا کو ہکن آزار سے
پائی چھٹی روز کی بیگار سے

لاش ہی اٹھے یہاں سے تو اٹھے
اٹھ چکے ہم آستانِ یار سے

ہر قدم پر سو طرح کی مستیاں
ٹپکی پڑتی ہیں تیری رفتار سے

بے سبب چھاگل نہیں کرتی ہے شور
یہ بھی نالاں ہے تیری تلوار سے

کر چکے قتل اب کہیں رسوا نہ ہو
جاؤ دھو ڈالو لہو تلوار سے

کیوں برستی ہے اداسی اے صبا
کون گل رخصت ہوا گلزار سے

تھے وہ موسیٰ غش پہ غش آیا جنہیں
ہاں تو آنکھیں کھل گئیں دیدار سے

میں اسے پیرِ مغاں سمجھا امیر
مست جو نکلا درِ خمار سے

حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت مومن نے اسی زمین میں غزل پڑھی آپ کی غزل بھی پسند فرمائی گئی۔

غزل

قتل ہو کر ہم بچے آزار سے
عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے

فصد کی حاجت مجھے کیا چارہ گر
بہ گیا خوں دیدۂ خونبار سے

کھا گیا جان آکے دوں اسکو نکال
میں نہیں خوش صحبت غمخوار سے

کیوں نہ کاٹیں لب اطبا مر گیا
حال پوچھتا تھا تیرے بیمار سے

وعدہ کر کے وہ نہ آئے نامہ بر
تو نے پوچھا ہوئیگا تکرار سے

لاغری سے زندگی مشکل ہوئی
ہے گراں تر جان جسمِ زار سے

ذکر اشک غیر میں رنگینیاں
بوئے خوں آئی تیری گفتار سے

گر دعا کرتا ہوں مومن وصل کی
ہاتھ باندھے ہے وہ بتِ زنار سے

در اصل حضرت مومن اس زمین میں دو غزلہ کہہ کر لائے تھے۔ پہلی غزل کا مطلع تھا۔ مطلع :-

دیتے ہو تسکیں میرے آزار سے
دوستی تم کو نہیں اغیار سے

اور دوسری غزل کا مطلع تھا۔

زہر ٹپکے ہے نگاہِ یار سے
موت سوجھی نرگسِ بیمار سے

اور پہلی غزل کا مقطع تھا۔

کہہ غزل اک اور بھی مومن کہ ہے
شوق اس بت کو ترے اشعار سے

لیکن حضرت امیر مینائی کی غزل سن کر جرات ہوئی کہ دونوں غزلیں سنا دیں آپ نے دانشمندی فرمائی کہ دونوں غزلوں کے چیدہ چیدہ شعر انتخاب فرمالیے اور آٹھ شعر کی غزل پڑھ دی۔

حاضرین نے حضرت مرزا صاحب سے استدعا فرمائی کہ آپ وہ غزل جس کی زمین خیال اچھا ہے۔ سنائیں۔ جناب مرزا صاحب نے بہتیری معذرت فرمائی لیکن غزل سنانے پر مجبور ہو گئے اور غزل پڑھی۔

غزل

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جسکو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر و سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مقطع پر حضرت ولی نے فرمایا۔ مرزا صاحب اتنی یہ شکایت نہ فرمائیے۔ اب تو جنت میں بھی مشاعرہ کا سامان فراہم ہو گیا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

حضرت ولی نے فرمایا۔ خاکم بدہن۔ کہیں آپ کا شعر غم فردا کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ مرزا صاحب کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے گویا انھیں علم تھا کہ یہ محفل آخری ہے۔ اس کے بعد ساری عمر تڑپ تڑپ کر گذر جائے گی اور ذوقِ سخن دب کر رہ جائے گا۔ ان کے بعد حضرت داغ نے اس زمین میں غزل فرمائی جو سب نے پسند فرمائی۔ مرزا صاحب نے اکثر شعروں پر وجد کیا اور بار بار سنا۔ وہ غزل ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

گو دل آزار ہو اچھوں کا خیال اچھا ہے
سو بلاؤں سے بھرا رمانِ وصال اچھا ہے

یہ تیری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

تاک کر دل کو وہ فرماتے ہیں مال اچھا ہے
یہ خدا کی قسم اندازِ سوال اچھا ہے

وہ عیادت کو میری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبئ تقدیر سے حال اچھا ہے

کون اس عشق میں صحت کے اٹھائے الزام
ہم مرے جاتے ہیں جس روز سے حال اچھا ہے

گریۂ شب سے جو تاثیر کی امید بندھی
ہنس کے تقدیر پکاری کہ خیال اچھا ہے

آپ کی جس میں ہو مرضی وہ مصیبت بہتر
آپکی جس میں ہو خوشی وہ ملال اچھا ہے

داغؔ تم اور پڑھو شعر ابھی چپ نہ رہو
کہ یہاں جمع ارباب کمال اچھا ہے

اک دکاں میں ابھی رکھ آئے ہیں ہم اپنا دل
دور سے سب کو جتاتے ہیں کہ مال اچھا ہے

لوگ کہتے ہیں بھلائی کا زمانہ نہ رہا
کوئی کہہ دے کہ برائی کا مآل اچھا ہے

ایسے بیمار کی افسوس دوا کیونکر ہو
ابھی دم بھر میں برا ہے ابھی حال اچھا ہے

دل میں تو خوش ہیں تسلی کو میری کہتے ہیں
آپ مرنے کے نہیں آپکا حال اچھا ہے

عرصۂ حشر میں سب ہو گئے خواہاں اس کے
لوگ کہتے ہیں اشارہ وہی ہے یہ مال اچھا ہے

ہم سے پوچھے کوئی دنیا میں ہو کیا شے اچھی
رنج اچھا ہے غم اچھا ہے ملال اچھا ہے

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغؔ کا حال اچھا ہے

حضرت مولانا حالیؔ سے استدعا فرمائی گئی کہ آپ اپنے کلام سے مستفید فرمائیں۔ حاضرین کے اصرار پر حضرت مولانا نے ایک غزل پڑھی۔

غزل

حشر تک یاں دل شکیبا چاہیئے
کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیئے

ہے تجلی بھی نقاب روئے یار
اس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیئے

غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیر غم
حال دل پھر اس کو لکھا چاہیئے

ہے دل افگاروں کی دلداری ضرور
گر نہیں الفت مدارا چاہیئے

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیئے

دوستوں کی بھی نہ ہو پرواہ جسے
بے نیازی اس کی دیکھا چاہیئے

بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کیجئے اغماض جتنا چاہیئے

شیخ ہے ان کی نگاہ جادو بھری
صحبت رنداں سے بچنا چاہیئے

لگ گئی چپ حالیؔ رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیئے

غزل بہت پسند فرمائی گئی خوب داد ملی۔ ان کے بعد حضرت داغؔ نے اس زمین میں غزل پڑھی۔ غزل کی بحر چھوٹی ہے اس لیئے زیادہ مؤثر رہی گویا تیروں کا کام نشتروں نے کیا۔ حضرت داغؔ نے اپنے مخصوص انداز میں اس غزل کو ادا فرمایا۔ آپ کی حسن ادائیگی نے غزل کو اور بھی چمکا دیا۔ لیجئے وہ غزل ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

سب متاعِ دین و دنیا چاہیئے
اے ہوس تجھ کو بھی کیا کیا چاہیئے

دین و دل یا مالِ دنیا چاہیئے
آپ کو کیا چاہیئے کیا چاہیئے

عقل کہتی ہے نہ ہو آزارِ عشق
شوق کہتا ہے کہ ہونا چاہیئے

دل مقابل اس صفِ مژگاں کے ہے
لڑنے مرنے کو کلیجا چاہیئے

اڑ گیا بادِ خزاں سے آشیاں
مجھ کو تنکے کا سہارا چاہیئے

لینے والے کو تو کوئی حد بھی ہو
دینے والے کو بہت سا چاہیئے

اب تو دیکھی ہے بری حالت مری
پھر بھی دیکھینگے وہ دیکھا چاہیئے

عاشقی میں جو نہ کرنا تھا کیا
اب ہمیں کیا کام کرنا چاہیئے

مر نہ جاؤں کر کے ارمانِ وصال
موت کو کوئی بہانہ چاہیئے

اسکو مل جائے اگر چاہت کی داد
چاہنے والے کو پھر کیا چاہیئے

داغ کو حور و پری سے کیا غرض
آدمی اچھے سے اچھا چاہیئے

حضرت مولانا حالی نے مرزا صاحب سے فرمایا۔ پیرومرشد! گستاخی معاف۔ آپ کی وہ غزل سننے کو جی چاہتا ہے جس کی زمین ہے "اچھوں کو جتنا چاہیئے"۔ مرزا صاحب نے فرمایا بھئی مولانا۔ نہ وہ دن رہے نہ وہ صحبتیں رہیں۔ نہ وہ دنیا رہی نہ وہ اچھے رہے پھر اب کسے چاہیئے اور

کیا چاہیے - حوران بہشتی ہیں کہ خدمت پر متعین ہیں - نظر کو کوئی دوسرا نظارہ ہی نصیب نہیں ہے - بڑی پھیکی زندگی ہے میاں کی - بھائی ذوق نے کسی وقت یہ شعر سنایا تھا اسی روز سے کھٹک گئی ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے؟

مولانا نے مسکرا کر فرمایا پیر و مرشد لیکن غزل تو سنا ہی دیجیے

مرزا صاحب مسکرائے اور غزل پڑھی -

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

شمع محفل نے ہنس کر فرمایا۔ کیوں مرزا صاحب جوانی میں تو آپ خوب ہونگے۔ ایک مغل اور دوسرے مے کش یہ قد اور یہ صورت۔ اس پر گوری رنگت اور شراب کی سرخی۔ ابھی سلسلۂ کلام جاری ہی تھا کہ سب ہنس پڑے۔ مرزا صاحب نے جواباً فرمایا۔ قبلہ یہ شعر اُس وقت کے لیے نہیں کہا گیا تھا بلکہ آج کے لیے کہا تھا۔ چوکھٹا آپ کے سامنے ہے خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ پیش گوئی ٹھیک تھی یا نہیں۔ تمام لوگ ہنس پڑے خوب قہقہے اڑے۔ اتنے میں ایک صاحب مشاعرہ میں داخل ہوئے۔ سب کی نگاہیں اٹھیں۔ ایک شخص نے پہچان کر کہا۔ اور وہ حضرت نظیر اکبرآبادی! مرزا صاحب نام سے متعارف تھے اٹھے اور ملے۔ شمع محفل نے آپ کا عوام سے تعارف فرمایا۔ حضرت ولی نے کلام سنانے کے لیے استدعا فرمائی۔ نظیر صاحب نے ایک غزل سنائی جو انھیں اس وقت یاد تھی۔ غزل پسند فرمائی گئی۔ وہ غزل ملاحظہ فرمایئے۔

غزل

دور سے منہ کو لگا جاوے تو کچھ دور نہیں
اپنے منظور کو یہ بات بھی منظور نہیں

تاک کر سنگ نہ پھینکو کہ میرے سینے میں
دل پر اک آبلہ ہے خوشۂ انگور نہیں

اک تبسم ہے بتوں کا میری صحت کی دوا
پر وہ شوخی سے یہ کہتے ہیں تو رنجور نہیں

ان کا گورا وہ بدن ہے کہ برابر اسکے
سیم خالص نہیں موتی نہیں بلور نہیں

حسن ایسا ہی دمکتا ہے جو سہتا ہو نظیر
آدمی کیا کہ پری کا بھی یہ مقدور نہیں

ان کے بعد حضرت داغ نے اسی زمین میں غزل پڑھی جو کہ بہت پسند فرمائی گئی۔

غزل

چاک ہو پردہ وحشت مجھے منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ گریبان سے کچھ دور نہیں

وصل سے یاس ہوا ایسا دلِ مجبور نہیں
بت اگر دور ہے مجھ سے تو خدا دور نہیں

سجدے کرنے سے مٹا خط جبیں اے زاہد
ہم کہے دیتے ہیں قسمت میں تیری حور نہیں

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا
دیکھ پچھتائے گا خاموش یہ دستور نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہونگے
صاف کہدیجیے ملنا ہمیں منظور نہیں

تجھے دی کوہکن و قیس سے مجھ کو نسبت
کوئی دیوانہ نہیں میں کوئی مزدور نہیں

کیا کرے داغ کوئی اس کی محبت کا علاج
وہ کلیجہ ہی نہیں جس میں یہ ناسور نہیں

حضرت داغ نے بڑے فخر سے یہ غزل پڑھی انہیں معلوم تھا کہ حضرت نظیر کی غزل پر اور کسی کے پاس غزل نہیں ہے لیکن مرزا صاحب نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا کہ بھئی دیکھنا شاید ان اوراق میں میری وہ غزل ہو جس کی زمین ہے " ذکر میرا بربدی بھی اسے منظور نہیں " صاحبزادے نے ورق گردانی کی اور ایک کاغذ مرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ مرزا صاحب نے شمع مجلس سے اجازت طلب فرمائی۔ بہ اجازت صدر محفل

مرزا صاحب نے وہ غزل پڑھی - اس کا ہر شعر حریفوں پر چوٹ تھی سمجھنے والے کے لئے موت - حریف ہونٹ چباتے تھے اور رہ جاتے تھے - کرتے بھی کیا - مرزا صاحب کے سامنے غزل پڑھنا صاحبِ ذوق ہی کا کام ہے اور کہنہ مشاق لوگوں کا لیجیئے وہ غزل ملاحظہ فرمائیے -

غزل

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہمکو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوی پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

حضرت ظہوری بھی اسی مجلس میں تشریف فرما تھے اٹھے اور فرمایا مرزا صاحب بندہ تو آپکے مراتب کا معتقد ہے پھر یہ اشارہ کس کی طرف ہے

مرزا صاحب نے فرمایا۔ پیر و مرشد! جو آپ سے کم ہیں۔ سب ہنس پڑے اور پانے والے ہار گئے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گیٹ کے اندر دو صاحب کھڑے نظر آتے۔ خدام ادب سے وہ کچھ معلوم فرما رہے تھے۔ دربان نے آکر شمع مجلس سے عرض کی حضرت! دو صاحب تشریف لائے ہیں اور یہ چپٹ بھیجی ہے۔ شمع مجلس نے چٹ پڑھی اور بیساختہ بول اٹھے۔ ارے حضرت ریاضؔ اور اکبر صاحب۔ مرزا صاحب نے دریافت فرمایا کون ریاضؔ صاحب! ریاض خیرآبادی؟ اور اکبر... اکبر الہ آبادی! شمع مجلس نے فرمایا جی وہ دونوں تشریف لائے ہیں۔ مرزا صاحب اور حضرت امیر خسرو ان کے استقبال کے لیے گیٹ تک تشریف لے گئے اور انھیں اپنے ساتھ مسکراتے ہوئے سٹیج پر لے آئے۔ دو کرسیاں اور بچھائی گئیں۔ شمع مجلس نے تعارف فرمایا۔

آپ قبلہ سید ریاضؔ احمد صاحب خیرآبادی ہیں؛ جونہی یہ جملہ حضرت مینائیؔ نے سنا لپک کر اٹھے اور حضرت ریاضؔ نے اپنے محسن و مکرم استاد کو دیکھا اور جوش سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں آگے بڑھے اور گلے ملے) اور آپ لسان العصر حضرت سید اکبر حسن صاحب اکبر الہ آبادی ہیں۔ خان بہادر صاحب اپنی ظریفانہ شاعری کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ مشرقی تہذیب کے پرستار۔ حساس دل اور مفکر دماغ رکھتے ہیں۔ بظاہر آپ کی ظرافت ہنساتی ہے لیکن در اصل خون کے آنسو رلاتی ہے۔" حاضرین نے تالیوں کے شور سے استقبال فرمایا۔" ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لے آئے۔ لیکن افسوس سا ہے کہ مصروفیتوں کے باعث کچھ وقت سے پہلے تشریف نہ لا سکے تاہم ان بزرگوں

کے شکر گزار ہیں کہ بزم ادب کی آرزو کو ٹھکرایا نہیں اور ہمیں بھولے نہیں"۔
ایک بار پھر تالیوں کے شور سے محفل گونج اٹھی۔ شمع مجلس نے فرمایا لیجئے
اب آپ پہلے حضرت اکبر صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیے۔ پھر تالیوں
کا شور اٹھا۔ حضرت اکبر ذرا آگے بڑھے اور فرمایا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا کلام
مشاعروں میں سنانے کے قابل نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جو آنکھوں
سے دیکھتا تھا زبان سے کہہ دیتا تھا۔ اور جو کہتا تھا وہ بے لاگ کہتا تھا۔ دیکھے
ہوئے دل کی داستان کو احاطۂ تحریر میں لے آتا تھا لوگوں نے اسے شاعری
سمجھا۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو میری آنکھوں سے دیکھ کر پڑھتے ہیں اور مجھ سا
احساس رکھ کر سمجھتے ہیں۔ لیکن شمع محفل کا ارشاد اور آپ حضرات کا اصرار سر
آنکھوں پر۔ دو چار شعر یاد ہیں سن لیجئے۔ کاش میری یہ آواز جنت کی ٹھنڈی
ہوائیں پھر دنیا والوں تک پہنچادیں۔ شاید یہ ٹھنڈے شرارے سلگتی ہوئی
آگ کو شعلوں میں تبدیل کر دیں (ان فقروں کے ساتھ ہی حضرت اکبر کی آنکھوں
سے آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو پونچھے اور کلام سنایا۔)

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

قہقہے اٹھے۔ واہ واکی صدائیں بلند ہوئیں۔ دوبارہ کہوایا گیا۔

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

تالیوں کا شور اٹھا۔ حساس دلوں نے خون کے آنسو بہائے۔ حضرت

حضرت اکبر صاحب نے فرمایا۔ اب نہ مجھ سے کہا جائے گا اور نہ آپ سے سنا جائے گا میرے نالوں سے محفل مکدر کیوں ہو اور میری فغاں سے آپ افسردہ خاطر کیوں ہوں لیجئے غزل کا ایک شعر یاد آیا۔ سنیئے۔

محبت کا تم سے اثر کیا کہوں
نظر مل گئی دل دھڑکنے لگا

تالیوں کا شور اٹھا۔ واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ خوب داد ملی۔ سامعین نے ہزار اصرار فرمایا لیکن انہوں نے اس کے بعد کوئی شعر نہ سنایا اور آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے سرک گئے ان کے بعد شمع مجلس نے حضرت ریاض صاحب سے استدعا فرمائی۔ حضرت ریاض ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ذرا آگے بڑھے اور فرمایا حضرت اکبر کے بعد میں کیا عرض کروں گا۔ مرزا صاحب فوراً بول اٹھے اب ظرافت کے پھول کھلیں گے۔ ان کی خوشبو سے دماغ معطر اور خیالات اطہر ہونگے۔ ریاض صاحب نے فرمایا۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے پھر تالیوں کا شور اٹھا۔ حضرت ریاض نے کچھ اشعار زبانی ارشاد فرمائے اور سکریٹری بزم ادب نے لکھ لیئے وہ رپورٹ ہم تک پہنچی۔ آپکی تفریح طبع کے لیے سلسلہ اشاعت میں داخل کر کے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام
نہ پیئے اور جھومتا جائے

شمع مجلس نے فرمایا۔ حضرت! حضرتِ ریاض نے اِس خیال سے کہ مبادا کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے اپنے جذبات و تخیلات کی

تردید فرمادی ہے ۔ اور حقیقت یہی ہے کہ آپ بڑے پاک نفس اور سچے مسلمان ہیں
آپ کا رندانہ رنگ آپ کی شاعری ہی کی حد تک ہے ۔ ع
جو رنگ قال میں دیکھا وہ ان کا حال نہ تھا
حاضرین نے تالیوں کے شور سے آپ کی تائید فرمائی۔ حضرت ریاض نے
شعر پڑھے۔ ؎

اس شیخ کہن سال کی اللہ نے بزرگی
جنت میں بھی یہ جُھکے جواں ہو نہیں سکتا

یہ شعر شیخ جرأت کی طرف اشارہ فرما کر پڑھا۔ محفل میں قہقہے اڑے اور تالیوں کا شور اٹھا۔ محفل سے ایک صاحب اٹھے اور پوچھا۔ گستاخی معاف۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو شمع مجلس سے کچھ عرض کروں۔ آپ صاحب کون ہیں اور کن بزرگ سے تلمذ فرماتے ہیں؟ شمع مجلس سمجھ گئے کہ یہ شخص ضرور اونچا سنتا ہے۔ آپ نے پھر بلند آواز سے تعارف فرمایا۔ اور حضرت ریاض نے اپنے بزرگ استاد کے تعارف میں یہ شعر پڑھا۔

مستِ میناہوں پیا ہے میں نے
جامِ امیر احمدِ مینائیؒ کا

اس کے بعد آپ نے اپنے مخصوص رنگ کے شعر پڑھے ۔

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

؎

اُن کے آنچل میں ادا بنکر قیامت چھپ چکی
وُہ مری جانی ہوئی وہ میری پہچانی ہوئی

؎

کوئی منہ چوم لیگا اس نہیں پر
شکن رہ جائیگی یونہی جبیں پر

؎

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھا لے

؎

مر گئے پھر بھی تعلق ہے یہ میخانے سے
مرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

؎

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

؎

جامِ مے توبہ شکن توبہ میری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

ے

وہ جانا میرا روٹھ کر میکدے سے
صراحی کا مجھ کو وہ آواز دینا

ے

یہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی
راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

ے

یہ چھلکتا ہوا کیا جامِ شراب آتا ہے
لے میں قربان میرا عہدِ شباب آتا ہے

ے

در حقیقت کر رہی ہے کام ساقی کی نظر
میکدے میں گردشِ ساغر برائے نام ہے

مرزا صاحب نے فرمایا۔ سیّد اعلیٰ! اب پئے تو یہ عالم ہے اور اگر پی ہوتی تو کیا ہوتا۔ میں تو حیران ہوں کہ یہاں کیونکر گذری ہوگی۔ نہ وہ دنیا نہ وہ دنیا والے نہ وہ حسن نہ وہ حسین نہ وہ رونق نہ وہ محفل۔ حضرت ریاضؔ نے فرمایا۔ مرزا صاحب! حسن تخیل کی داد دیتا ہوں۔ بس ایک جنت ہے ورنہ۔

ے

نہ وہ محشر فروش شوخیٔ ناز — نہ وہ ہنگامہ ہائے فتنہ پرداز
نہ کسی کی وہ چنپئی رنگت — نہ کسی کی وہ چلبلی صورت

نہ وہ نازک کمر سے بل کھاتا نہ وہ لغزش نہ وہ سنبھل جانا
نہ چھریرا بدن نہ بکھرے بال نہ وہ کافر کی لڑکھڑاتی چال
نہ وہ آنچل کا ڈالنا ہر بار نہ وہ دوپٹہ سنبھالنا ہر بار
نہ وہ شوخی نہ آنہ تنڈ پر وہ ہنسی نہ بلاخیز چتونیں تیکھی
نہ وہ جوشِ شباب کی آن بَن نہ اداؤں میں اب وہ چنچل پن

نہ وہ نغمہ نہ جانفزا آواز
نہ مغنی نہ کوئی نغمہ ساز

یہ شکایت نامہ سن کر حورانِ بہشتی کے سینوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ سب اللہ کے حضور میں گئیں اور عرض کی "خداوندِ دو جہاں! مشاعرے میں آدم نے ہماری توہین کی ہے جو ہمیں سخت ناگوار گذری ہے۔" سالکِ کون و مکاں نے حضرت جبرئیلؑ کو بلا کر فرمایا۔ ہمارے بندوں سے کہدو کہ ہم نے تمھارے جی بہلاوے کا سامان کیا تھا تم نے اپنا شوق پورا کر لیا اب اس تماشے کو یہیں ختم کردو۔ اور آیندہ کسی کو ہمارے حضور میں اس قسم کی جرات نہ ہو۔" حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور ادب بجالائے۔ حضرت جبرئیلؑ نے اللہ کا پیغام سنایا۔ حضرت مرزا غالب نے نہایت ادب سے فرمایا۔ یا حضرت۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

حضرت جبرئیلؑ کو مرزا صاحب کی بات ناگوار گذری اور ذرا ترشی سے پیش

آئے حضرت ریاضؔ نے فرمایا ؎

اِتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی

ہم رند سن کے قلقلِ مینا کہیں جسے

حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا۔ در اصل آپ ہی کی خرافات نے عرش نشینوں کو رنجیدہ خاطر کیا ہے۔ شراب کے سوا کچھ یاد ہی نہیں۔ شراب کا شوق تھا تو پی کیوں نہ؟

حضرت ریاضؔ نے جواباً فرمایا۔ آدم کے دل کو یہ قدسی کیا جانیں صاحب! ہمنے وہ شراب پی ہے جو قدسیوں کو بھی نصیب نہیں جس کی شان یہ ہے کہ۔

بنائے کعبہ پڑتی ہی جہاں ہم خشت خم رکھدیں

جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے۔

حضرت امیر خسروؔ نے اٹھ کر فرمایا۔ تکرار جانے دیجئے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل ہمارا فرض ہے۔ یا حضرت آپ بزم ادب کی طرف سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں اور اللہ کے احسانمند ہیں آپ اطمینان رکھئے جنّت میں مشاعرہ ہی نہ ہوگا۔ حضرت جبرئیلؑ تشریف لے گئے۔ لوگ اس آخری مشاعرہ کی یاد کو لیکر اٹھ کھڑے ہوتے اور محفل برخاست ہوئی۔

وہی کتابیں جنکی آپ کو تلاش تھی

ہماری کتابیں ہندوستان کے کونہ کونہ میں پہنچ رہی ہیں۔ وجہ کیا کہ ان کے مطالعہ سے عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کو تفریح طبع کے ساتھ ساتھ پاکیزگی، بلند خیالی اور دینی و دنیاوی ترقی کے کبھی نہ بھولنے والے سبق ملتے ہیں۔ اب جب کہ ہمارا ملک آزاد ہو گیا ہے۔ ہمارا مطمح نظر نوجوانوں کو پستی کی طرف سے ہٹا کر دوسرے ملکوں کے سامنے ایک نمونہ بنا کر دکھانا ہے۔ یہ کتابیں آپ کی ادبی، ہیاتی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب پیدا کر دینگی۔

رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	۳ روپے ۸ ر
رضیہ کی مشرقی مغربی گلکاری کشیدہ کاری	رضیہ سلطانہ	للعہ ۴ ر
رضیہ کے خطوط	رضیہ سلطانہ	عہ ۸ ر
رضیہ کے افسانے	رضیہ سلطانہ	۱۵ ر
لعل و گوہر	رضیہ سلطانہ	عہ ۴ ر
باپ کا خط بیٹی کے نام	مولوی حبیب الحسن	۱۲ ر
جواہر لال کی کہانی	محمد رحیم دہلوی	عہ ر
زارینہ (ناول)	" "	۶ ۸ ر
تازیانہ	" "	عہ ۸ ر

فاطمہ کا لال ۔ شہادت حسین	محمد رحیم دہلوی	۴؍عہ
پنکھڑیاں (افسانے)	″ ″	عہ
بیوی محبت کیوں کرے	نادرہ سلطانہ	۸؍عہ
یہ کیا؟ (ناول)	آلفت منہاس بی اے	۴؍للعہ
گاندھی جی (سوانح)	آزاد	۵؍صر
شاہنشاہ رضیہ سلطانہ	مفتی انتظام اللہ شہابی	۸ر
رضیہ موڈرن فیشن بک	رضیہ سلطانہ	۴؍للعہ
محاورات داغ	ولی احمد ایم۔ اے	۲؍لے
بیگمات اودھ کے خطوط	مفتی انتظام اللہ شہابی	عہ
آوارہ گرد کے خطوط	ش مظفر پوری	۸؍عہ
ہندوستان ہمارا (ناول)	رضا زیدی	۸؍عہ
چاند سا چہرہ (ناول)	محمد رحیم دہلوی	۴؍للعہ
پتھر سے ہیرا	ڈاکٹر سعید احمد بریلوی	عہ
دفینے (افسانے)	امداد انصاری	۴؍عہ
چھالے (افسانے)	فردوس صہبائی	سے
مکمل تاریخ آزاد ہند فوج	اسرار احمد آزاد	۲؍لے
دل کی باتیں (افسانے)	سید کاظم علی	۴؍عہ
قیمتی جہیز (نصیحت)	محمد رحیم دہلوی	عہ
ہم اور وہ (علمی مقالہ)	نواب خواجہ محمد شفیع	۱؍۸عہ

رضیہ کراس اسٹیچ	رضیہ سلطانہ	للعہ/
شرح میر درد	خواجہ محمد شفیع	عہ/
بہادر شاہ کا خواب (افسانے)	" "	۱ے/
نئے خاکے	قدوس صہبائی	۱۲/
شہیدِ کربلا	محمد رحیم دہلوی	۵/
اجمیر شریف کی سیر	" "	۵/
مرد زیادہ مکار ہوتے ہیں یا عورتیں	رضیہ سلطانہ	۵/
عشق جہانگیر	خواجہ محمد شفیع بی۔اے	۱ے/
شکوہ جواب شکوہ	ڈاکٹر اقبال	۱/
اگر میں ڈکٹیٹر ہوتی	رضیہ سلطانہ چمن	۵/
انقلابی مولوی	محمد رحیم	۵/
سُرخ لفافہ	اے۔اے۔آزاد	۳ے/
سحر ہونے تک	رضا زیدی	عہ/

ان کے علاوہ ہر قسم کے قرآن مجید مترجم معریٰ اور قاعدے سیپارے نیز ہر قسم کی علمی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور تاریخی کتابیں ہم سے طلب فرمائیے۔